اسلامی علوم و تحقیقات اور زبان و ادب کا ترجمان ماہنامہ

شمارہ:...۵

النخیل

کراچی

مدیر

ابن الحسن عباسی

اسلامی علوم وتحقیقات اور زبان وادب کا ترجمان ماہنامہ

النخیل

شمارہ: 5 ذی الحجہ 1440ھ اگست 2019ء

مدیر

ابن الحسن عباسی

معاون مدیر

محمد بشارت نواز

ادارت ومشاورت

مولانا محمد حنیف جالندھری　پروفیسر خورشید رضوی　ڈاکٹر تحسین فراقی

سید عدنان کاکاخیل　جاوید اختر بھٹی　مفتی محمد ساجد میمن　محمد شفیع چترالی

راشد الحق سمیع　حافظ محمد ندیم

جامعہ تراث الاسلام، شاہ فیصل ٹاؤن، کراچی

alnakhil786@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدائے نخیل	حضرت فاروق اعظم کی تاریخ شہادت.....	مدیر کے قلم سے..........	۳
تعلیم وتربیت	دینی مدارس اور جدید علوم.. احتیاط طلب پہلو.	مدیر کے قلم سے..........	۵
اصلاحِ معاشرہ	فتویٰ اور تقویٰ..........................	مفتی ناصرالدین مظاہری...	۱۲
علم وتحقیق	ہندوستان میں علم حدیث...............	حضرت مفتی ولی حسن ٹونکی..	۱۹
یادگارِ زمانہ	علامہ عبدالعزیز میمن.....................	ڈاکٹر خورشید رضوی........	۳۰
مسافرانِ آخرت	1440ھ کے مسافرانِ آخرت.........	محمد بشارت نواز...........	۴۵
مسافرانِ آخرت	اور ذکر کی مجلس سونی ہوگئی...........	مفتی محمد عفان منصور پوری..	۵۴
طب وصحت	بلڈ پریشر کا علاج.........................	ادارہ................	۵۸
اصلاحِ معاشرہ	لمحاتِ زندگی کو قیمتی بنانے کا مجرب نسخہ.....	مفتی محمد تقی عثمانی صاحب..	۵۹
مرے نام آتے ہیں	تاثرات..................................	ادارہ................	۶۱
جامعہ کی سرگرمیاں	شب وروز.............................	مولانا فضل الرحمٰن........	۶۳

فی شمارہ: .... 60روپے **سالانہ زرِتعاون:**.... 700روپے

خط وکتابت کا پتہ:..... جامعہ تراث الاسلام، شاہ فیصل ٹاؤن، کراچی

رابطہ نمبر:.........03343116964،03004097744

ای میل ایڈریس:alnakhil786@gmail.com

صدائے نخیل

حضرت فاروق اعظم کی تاریخ شہادت

مدیر کے قلم سے

بعض دوستوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تاریخِ شہادت کے حوالہ سے تحقیق پوچھی ہے، حضرت عمر کی تاریخِ شہادت میں مختلف اقوال ہیں لیکن جمہور مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ آپ کی شہادت ماہ ذی الحجہ میں ہوئی ہے ایک آدھ قول یکم محرم کا بھی ہے لیکن وہ ضعیف ہے، ہم نے جس قدر مراجع دیکھے، تقریباً سب ہی نے ماہ ذی الحجہ میں ان کی شہادت کا قول ذکر کیا ہے۔

چنانچہ طبری نے ''تاریخ طبری'' (ج 4 ص: 193) میں، ابن سعد نے ''طبقات کبریٰ'' (ج 3 ص: 195) میں، ابن اثیر نے ''الکامل'' (ج 3 ص: 448) میں، ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' (ج 7 ص: 134) میں، مسعودی نے ''مروج الذہب'' (ج 2 ص: 448) میں، عمر ابن شبہ نے ''تاریخ مدینہ'' (ص: 943، 944) میں، ابن خلدون نے ''تاریخ ابن خلدون'' (ج 2 ص: 569) میں، محب الدین طبری نے ''الریاض النضرۃ'' (ص: 418) میں، علامہ دینوری نے ''الاخبار الطوال'' (ص: 140) میں، علامہ مزی نے ''تہذیب الکمال'' (ج 7 ص: 468) میں، حافظ ابن حجر نے ''تہذیب التہذیب'' (ج 5 ص: 286) میں، قلقشندی نے ''نہایہ الارب'' (ص: 58) میں اور علامہ سیوطی نے ''تاریخ الخلفاء'' (ص: 244) میں، ماہ ذی الحجہ کے اندر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کا قول ذکر کیا ہے۔

البتہ ابن عساکر نے ''تاریخِ دمشق'' (ج 44 ص: 467) میں اپنی سند کے ساتھ یکم محرم کا قول لکھا ہے لیکن وہ سند ضعیف ہے، بعض حضرات نے یکم محرم والے قول کے لئے علامہ ابن اثیر کی ''اسد الغابہ'' کا حوالہ دیا ہے لیکن ''اسد الغابہ'' میں ماہ محرم کے اندر آپ کی وفات کا ذکر کہیں نہیں ہے۔

متاخرین میں سے حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ''تحفہ اثنا عشریہ'' میں ماہ ذی الحجہ کے اندر حضرت عمر فاروق کی شہادت کو متفق علیہ قرار دیا اور دوسرے کسی قول کو سرے سے اہمیت ہی نہیں دی،

چنانچہ حضرت لکھتے ہیں:

''رہا تاریخ کا معاملہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت بلا اختلاف 28 ذی الحجہ کو واقع ہوئی اور یکم محرم کو مدفون ہوئے۔''　(تحفہ اثنا عشریہ صفحہ 493)

مولانا شبلی نعمانی نے حضرت فاروق اعظم کی سوانح پر ''الفاروق'' کے نام سے کتاب لکھی ہے اور کمال کی لکھی ہے، انہوں نے بھی ذی الحجہ کا قول اختیار کیا ہے، مولانا یوسف لدھیانوی شہید نے بھی ''آپ کے مسائل اوران کا حل'' میں ذی الحجہ کا قول نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''26 ذی الحجہ 23 ہجری بروز چہارشنبہ مطابق 31 اکتوبر 644ء کو نمازِ فجر میں ابولولو مجوسی کے خنجر سے زخمی ہوئے، تین راتیں زخمی حالت پر زندہ رہے، 29 ذی الحجہ 3 نومبر کو وصال ہوا، یکم محرم 24 ہجری کو روضہ اطہر میں آسودہ خاک ہوئے۔''

ان تمام حوالوں سے یہ حقیقت بے غبار ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جمہور مؤرخین کے نزدیک، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت ماہ ذی الحجہ میں ہوئی ہے.... ہندوپاک کے اس خطے میں ایک مکتب فکر نے آکر بارہ ربیع الاول کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش قرار دیا اور اسے ''عید میلاد النبی'' کا عنوان دے کر برصغیر کی سڑکوں اور گلیوں میں عام کرادیا، جب کہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش میں مختلف اقوال ہیں، کسی ایک تاریخ کو حتمی قرار نہیں دیا جاسکتا.... ٹھیک اسی طرح یہاں بھی ہو رہا ہے....

جمہور مؤرخین کے ایک تاریخی بیانیہ کو ماہ ذی الحجہ سے ماہ محرم کی طرف گھسیٹنے کی آخر ضرورت کیا ہے؟.... حقیقت یہ ہے کہ ذی الحجہ یا محرم کی تاریخوں سے حضرت فاروق اعظم کی عظمت پر کوئی فرق پڑنے والا نہیں.... حضرت عمر، عمر تھے اور فاروق اعظم تھے، مسلمانوں کی آبرو اور تاریخ اسلام کے ماتھے کا جھومر.... آتش پرست مجوسیوں اور رافضیوں کے علی الرغم....وہ شہ ابرار صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں خوابیدہ پیکر تابندہ، سدا گل گلزار رہا ہے اور رہے گا، بستی بستی، شہر شہر، نسل نسل، صدی صدی، زمانہ زمانہ....اس کے رشد و ہدی اور اس کے عدل وصفا سے لوح ایام کا غازہ رخشاں رہا ہے اور رخشاں رہے گا۔ اللہ ہمارا حامی وناصر ہو۔

ابن الحسن عباسی

تعلیم وتربیت

دینی مدارس اور جدید علوم...... چند احتیاط طلب پہلو

مدیر کے قلم سے

برصغیر میں دینی مدارس کا جو تاریخی پس منظر ہے، اس کو جاننے کے بعد اس حقیقت میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ یہ مدارس اسلامی علوم کی حفاظت کے لئے دفاعی مورچوں کے طور پر وجود میں آئے تھے، فرنگیوں کے جابرانہ تسلط کے بعد اللہ تعالیٰ نے چند بندوں کے دل میں دیوبند نامی بستی میں مدرسہ کی بنیاد رکھنے کی بات ڈالی اور آگے چل کر وہ مدرسہ ''دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے حق وصداقت، دعوت وعزیمت اور تعلیم وتربیت کا ایک ایسا لازوال حوالہ بن گیا کہ اس کی نہج پر پورے برصغیر میں ''مدارس'' کا ایک جال بچھتا چلا گیا، دینی مدارس کی یہ شکل عالم اسلام اور دنیا کے دوسرے کسی خطے میں موجود نہیں۔

ان مدارس کا سب سے اہم اور بڑا مقصد اسلامی علوم کی حفاظت رہا ہے اور عام مسلمانوں نے اسی مقصد کے پیش نظر علماء اور مدارس پر ہمیشہ اعتماد کرکے ان کے ساتھ ہر طرح تعاون کیا ہے اور اس طرح کیا کہ بیرونی اور اندرونی قوتوں کے دباؤ ڈالنے، ڈرانے، دھمکانے کے باوجود، ان کا یہ تعاون نہ صرف یہ کہ جاری رہا بلکہ اس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا رہا ہے حالانکہ مدارس کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ میں کبھی کمی نہیں ہوئی، مختلف ادوار میں عوام کے اندر مقبول پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کے اخبارات اور چینل اس مقصد کے لئے خریدے جاتے رہے، ''مدارس اور اس کے ملاؤں'' کو پسماندہ تہذیب کا نشان اور علم بردار قرار دیا گیا اور یہ بات لوگوں کے ذہنوں میں انڈیلنے کی کوشش کی گئی کہ ترقی کی راہ کا سنگ گراں یہی ''ملا'' ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس تمام تر منفی پروپیگنڈے کے باوجود لوگ جوق در جوق مدارس کا رخ کررہے ہیں اور ''ملا'' کو پسماندہ تہذیب کا نشان باور کرانے

کے باوجود عام مسلمان اسے اپنے دین وتہذیب کا محافظ اور محسن سمجھتا ہے۔

دینی مدارس کا اصل اور اساسی مقصد چونکہ اسلامی علوم کا تحفظ رہا ہے، اس لیے عصری علوم کی طرف یہاں توجہ کم اور ضمناً رہی ہے، یہ مدارس، ایسے رجال کار پیدا کرنے کے لیے بنتے رہے ہیں جو قوم اور نئی نسل کو اسلام کی ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک تمام مراحل طے کرائیں، جن میں قرآن پڑھانا، نماز سکھانا اور دین کی بنیادی باتیں بتلانا بھی شامل ہے اور قرآن وحدیث اور ان کے متعلقہ علوم سے براہ راست استفادے کی اعلیٰ صلاحیت پیدا کرنا بھی داخل ہے۔ یہ مدارس اپنے اس اساسی مقصد میں کامیاب رہے ہیں اور دین کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے رجال کار کی فراہمی کے حوالے سے کبھی بانجھ نہیں ہوئے۔

آج اگر ہمیں بڑی آسانی کے ساتھ قرآن پڑھنے اور پڑھانے کے لئے جید حافظ وقاری، منبر ومحراب کے لئے امام وخطیب، درس وتدریس کے لئے مدرس ومعلم اور فقہی مسائل کے حل کے لئے مفتی مل جاتا ہے تو یہ ان مدارس کے فعال کردار اور اپنے اساسی مقصد میں کامیابی کا ہی نتیجہ بلکہ کرشمہ ہے اور کوئی بھی ذی شعور شخص اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا۔ اعتراض یا شکایت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان مدارس کو اپنے مخصوص ہدف کے پس منظر میں دیکھنے کی بجائے وسیع تناظر میں دیکھا جائے اور دیکھنے کا یہ تناظر جس قدر وسیع ہوتا ہے اسی قدر اعتراضات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے، مثلاً ہمارے صدر پرویز مشرف صاحب اور ان کے ہم خیال طبقہ مدارس کو ایک اسلامی ریاست کے مکمل نظام تعلیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو انہیں شکایت پیدا ہوتی ہے کہ یہاں سے جغرافیے کا البیرونی، طب کا ابن سینا، کیمیا کا جابر بن حیان، الجبرا کا خوارزمی کیوں نہیں نکل رہے ہیں۔

ان کی یہ بات درست ہے کہ ایک تعلیم گاہ سے تمام شعبوں کے ماہرین نکلنے چاہئیں لیکن وہ یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ یہ مدارس دفاعی شکل میں اسلامی علوم کے محافظ کے طور پر کام کررہے ہیں اور وہ رجال کار ریاست کے ایک مکمل نظام تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک اسلامی، فلاحی مملکت کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا نصاب تعلیم مرتب کیا جائے اور پورے ملک میں یکساں نظام تعلیم کے تحت اسے اس طرح نافذ کیا جائے کہ امیر وغریب اور شاہ وگدا غرضیکہ

پوری قوم کی نئی نسل بغیر کسی طبقاتی امتیاز کے اسی ایک نصاب کو پڑھ کر گریجویشن تک پہنچے اور آگے مختلف شعبوں اور علوم کے ماہرین پیدا کرے، لیکن یہاں تو عالم یہ ہے کہ ایک ہی گلی کے اندر چار اسکول ہیں اور چاروں کا نصاب تعلیم اور معیار الگ ہے، طبقہ اشرافیہ کی تعلیم گاہیں خالص فرنگیانہ فضا میں یوں ڈھلی ہوئی ہیں کہ ان کا نصاب، نظام اور اساتذہ تک درآمد شدہ ہوتے ہیں، اس فاسد اور بکھرے ہوئے نظام تعلیم کے بالمقابل ''دینی مدارس'' اسلامی علوم کے محافظ کے طور پر کام کر رہے ہیں اور اس میں وہ بجا طور پر کامیاب ہیں۔

ملک وملت کے وسیع مفاد کے تناظر میں اگر اصلاح کا کام شروع کرنا ہے تو وہ تب ہی ہو سکے گا جب رائج نظام تعلیم کا سارا ڈھانچہ تبدیل کیا جائے اور نئے سرے سے بنیادیں رکھی جائیں۔ یہ قومی اور ملک گیر سطح پر حکومت اور ریاست کے کرنے کا کام تھا جو آج تک نہیں ہوسکا، ہاں بعض جزوی کوششیں ضرور کی گئی ہیں لیکن وہ ناکام ہوئی ہیں، پاکستان میں دو بڑی کوششیں ہوئیں ایک جامعہ عباسیہ، بہاولپور کی شکل میں جسے ریاستی وسائل کی مکمل سرپرستی حاصل تھی لیکن آج دوسری یونیورسٹیوں کی طرح وہ بھی ایک عام اور غیر فعال یونیورسٹی ہے اور اسلامی علوم کے ماہرین پیدا کرنے کے حوالے سے اس کا کردار صفر رہا ہے، دوسری کوشش ''ماڈل مدارس'' کی صورت میں ہوئی، ماڈل مدارس کی تجویز جناب محمود احمد غازی صاحب نے چند سال پہلے پیش کی تھی لیکن اسے بھی پذیرائی نہیں ملی یہ اور بات ہے کہ سابقہ کسی کوشش اور تجربہ کے ناکام ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا دانش مندی نہیں کہلائے گا کہ آئندہ بھی اس طرح کی کوئی سعی کامیاب نہیں ہوسکتی، ہوسکتی ہے اور ضرور ہوسکتی ہے کہ امکانات کی دنیا بڑی وسیع ہے۔

دینی مدارس میں عصری علوم (ریاضی، سائنس، انگلش وغیرہ) مڈل یا میٹرک کی حد تک داخل نصاب ہیں لیکن انہیں یہاں وہ توجہ حاصل نہیں جو عصری تعلیمی اداروں میں ان مضامین کو حاصل ہے۔ بعض مدارس کے صاحب درد علماء اور منتظمین کی تمنا ہے کہ مدارس سے ایسے علماء پیدا ہوں جو قدیم اور جدید دونوں علوم میں ماہر ہوں اور اسی حوالے سے قومی زبان اردو کے علاوہ ان کو بین الاقوامی زبانوں خاص کر انگلش اور عربی پر بھی عبور حاصل ہو، تاکہ وہ مؤثر طریقے سے جدید دنیا میں دین اسلام کی

دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دے سکیں اس مقصد کے لئے کئی مدارس میں پیش رفت ہورہی ہے لیکن مشہور ہے، ''زبان اپنے ساتھ کلچر لاتی ہے'' انگریزی زبان وتعلیم کے بارے میں شروع ہی سے علماء کی ایک جماعت کو تحفظات رہے ہیں اور انہیں یہ ناخوشگوار تجربہ ہوا ہے کہ اس سے وابستگی عموماً اسلامی تشخص کو ختم کردیتی ہے یا اس کے بارے میں انسان کو احساس کمتری میں مبتلا کردیتی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نے برسوں پہلے ''معارف'' کے کسی شمارے میں لکھا تھا:

> ''انگریزی خواں علماء کی ضرورت جیسی روز بروز بڑھ رہی ہے، وہ تو معلوم ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ علماء انگریزی خواں ہونے کے بعد عالم نہیں رہتے''۔

اس لئے دینی مدارس کو جدید وقدیم دونوں میں ماہرین پیدا کرنے کے لئے نصاب اور نظام تعلیم کو مرتب کرتے ہوئے درج ذیل باتوں کا بڑا خیال رکھنا چاہیے:

برصغیر میں رائج مغرب کے جدید نظام تعلیم کا سب سے مہلک اور خطرناک اثر یہ ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے تہذیبی ورثے سے متعلق احساس کمتری اور مرعوبیت کا شکار ہوجاتا ہے اور لاشعوری طور پر مغربی کلچر اور تہذیب کی برتری کا احساس اس کے دل ودماغ پر چھا جاتا ہے، ہمارے نزدیک اس وقت ایک مسلمان کے لئے جدید تعلیم کی یہ سب سے بڑی آزمائش ہے، مغرب کی مادی ترقی سے کون انکار کرسکتا ہے اور اس کی ترقی کے بے ضرر اصولوں کو اختیار کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں لیکن جدید مادی تعلیم سے وابستہ ہونے کے بعد مغرب کی تہذیب، مغرب کی زبان، مغرب کی آزادی کے سامنے مسلمان مرعوب ہی نہیں، مفلوج ہوکر رہ جاتے ہیں، ان تعلیم گاہوں میں جانے کے بعد شکست کا یہ وہ وار ہے جس سے بہت کم لوگ بچتے ہیں، مدارس سے وابستہ بہت سارے لوگ بھی اس زد میں آجاتے ہیں، وہ جدید تقاضوں کی اہمیت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والا ایمان کی ابدی صداقتوں، اسلامی تہذیب کی شاندار روایات اور مسلمانوں کی درخشاں تاریخ کے بارے میں شعور کمتری کا شکار ہوجاتا ہے۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان بچوں کو جدید تعلیم، یقین کامل اور ایمان اور اسلام سے متعلق مکمل احساس برتری کی فضا میں دی جائے، ان کے چھوٹے ذہنوں اور صاف دلوں میں یہ حقیقت نقش کی جائے کہ ایمان سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں، ایمان اور اس کے مطابق اعمال صالحہ ہی

پر انسانی زندگی کی نجات کا مدار ہے، اور یہی اس کائنات کی سب سے بڑی دولت اور سب سے بڑی سچائی ہے، یہ سائنس، یہ ٹیکنالوجی، یہ کمپیوٹر، یہ جغرافیہ، یہ زبانیں اور یہ فنون مادی ترقی کے لئے بہت کچھ ہونے کے باوجود، اخروی نجات کی نسبت سے کچھ بھی نہیں، ایمان کا یہ سبق انہیں اس طرح یاد کرایا جائے کہ وہ کارگاہ حیات میں اس پر کسی سمجھوتے یا سودے بازی کے لئے تیار ہوں نہ ہی اس سلسلے میں کسی طرح کی مرعوبیت کا شکار ہوں، وہ زندگی کے جس میدان میں جائیں لیکن انہیں اپنے ایمان پر بجا طور پر فخر ہو اور ایمان سے محروم قوموں کو قابل رحم سمجھتا ہو، اگر چہ وہ مادی ترقی کے نقطہ عروج تک کیوں نہ پہنچی ہوں۔

عصری جدید تعلیم سے وابستگی، بسا اوقات اسلام کی ابدی صداقتوں اور اسلام کے طرز زندگی سے متعلق، انسان کے عقیدے کو متاثر کر دیتی ہے، اخلاص وللّٰہیت، ایثار وہم دردی، امانت ودیانت، احتیاط وتقویٰ اس طرح کی بے شمار دائمی صداقتیں ہیں جو اسلام میں فوقیت وفضیلت کا واحد معیار ہیں لیکن جدید تعلیم کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دل میں ان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے اور مادی ترقی کے اوصاف واسباب کامیابی کا معیار ٹھہرتے ہیں۔اس لیے اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ خیر اور شر اور اعلیٰ وادنی کا جو معیار اور پیمانہ شریعت نے مقرر کیا ہے اس تعلیم سے اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا اثر نہ آنے پائے۔

ہمارے اکابر نے اس خطے میں اسلام کے لئے جو قربانیاں دی ہیں اور جس نہج پر کام کیا ہے، وہ محتاج تعارف نہیں، لیکن دینی مدارس سے وابستہ بعض افراد جب جدید تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں تو ان کے انداز سے اکابر اور بزرگوں کے کام کی توقیر کی بجائے۔۔۔اس کی تحقیر کی بو محسوس ہوتی ہے اور اکابر کے مرتب کردہ نصاب اور عام مدارس کے نظام کو وہ اہانت آمیز نگاہ سے دیکھتے ہیں یا اس کو بے فائدہ سمجھتے ہیں، ان مدارس کو طوطا چشمی اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں سے بے خبری کا گھسا پٹا طعنہ وہ بھی دینے لگتے ہیں۔

قدیم وجدید علوم کے ماہرین پیدا کرنا بے شک وقت کی بڑی ضرورت ہے لیکن اس ضرورت کو پورا کرتے ہوئے اگر ان بزرگوں، ان علماء اور ان مدارس کی حقارت دل میں بیٹھنے لگے جن کے دم سے ظلمت کدۂ ہندہ میں، اسلام کا چراغ روشن رہا تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔

یہ حقیقت نگاہ سے کبھی اوجھل نہیں رہنی چاہیے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ملک کی کسی یونیورسٹی میں اسلام کے موضوع پر لیکچر دینا، مستشرقین کے شبہات کے جوابات دینا یا جدید تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں کو ان کے اسلوب اور زبان میں مطمئن کرنا ایک اہم کام اور دینی خدمت ہے، ٹھیک اسی طرح کسی دیہات میں بیٹھ کر مسلمان بچوں کو قرآن اور دین کی بنیادی باتیں سکھانا بھی اہم ہے، ایک اسلامی اسکالر، پروفیسر، مقالہ نگار کی اہمیت اپنی جگہ ہزار درجہ تسلیم! لیکن اس سے دولت کی فراوانی اور بسا اوقات زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم اس بندۂ خدا کی اہمیت کیونکر کم کی جاسکتی ہے جو موسم کی گرمی اور نرمی کی پروا کیے بغیر، پانچ وقت، مسجد کے میناروں سے اللہ کی کبریائی کی صدائیں بلند کرکے کائنات کی ہستی کو لرزا دیتا ہے۔

اگر کسی ادارہ کا مقصد، پہلی قسم کی خدمت کے لئے لوگوں کو تیار کرنا ہے تو اس کی افادیت، اسی وقت تک رہے گی جب تک وہ دوسری قسم کی خدمت کے لئے افراد تیار کرنے والے اداروں کے کام کو بھی اہمیت کی نگاہ سے دیکھے۔

دو تین سال قبل ایک عالم دین تشریف لائے تھے، وہ ایک جدید نصاب کا تجربہ کر رہے ہیں، ان کا ہدف یہ ہے کہ عربی زبان پر مکمل قادر، اسلامی علوم میں ممتاز صلاحیت کے حامل افراد تیار کیے جائیں، شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور دیگر اساتذہ کے سامنے انہوں نے اپنے نصاب کے امتیازات بیان کیے اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اچھی اور اعلی استعداد کے ممتاز علماء تیار ہوں، حضرت شیخ نے جواب میں فرمایا:

”ممتاز اور اچھی استعداد کے حامل علماء کی تیاری اس وقت، امت مسلمہ کی ضرورت ہے اور کچھ ادارے، یہ ذمہ داری سنبھال لیں تو اچھی بات ہے لیکن ہمارے معاشرے کو نچلی سطح اور کم استعداد والے افراد بھی چاہیے، معاشرے کو جہاں زمانے کے حالات سے باخبر ایک فقیہ کی ضرورت ہے، وہاں بچوں کو قرآن سکھانے والے قاری، مسجد میں اذان دینے والے موذن اور دیہاتوں اور گوٹھوں میں نماز پڑھانے والے امام کی بھی ضرورت ہے، معاشرے کی یہ دینی ضرورتیں صرف ممتاز افراد سے پوری نہیں ہوسکتی اور ایک مکمل فیض رساں ادارہ وہی ہوسکتا ہے جس سے معاشرے کی تمام دینی

ضرورتوں کے لیے افراد تیار ہوں‘‘۔

اس سلسلے میں چوتھی گزارش یہ ہے کہ جدید عصری تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام نہ لیا جائے، اسے بچوں اور طلبہ پر اس طرح مسلط نہ کیا جائے کہ محسوس ہو کہ دنیا اور آخرت کی کامیابی اس کے بغیر ممکن نہیں اور اس میں مہارت ہی دونوں جہان کی سعادت کی علامت ہے۔ ایک عالم دین کے لیے اس کی جس قدر اہمیت ہے، اسی قدر وہ بتلائی جائے، اس کی اہمیت میں مبالغہ آرائی سے بچوں کا ذہن مرعوبیت کے لپیٹ میں آجاتا ہے۔

آخری گذارش یہ ہے کہ دینی مدارس میں جدید تعلیم کی طرف پیش رفت کرتے ہوئے مدارس کا اصل ہدف اور مقصد نظروں سے اوجھل نہیں رہنا چاہیے، جیسا کہ لکھا گیا کہ مدرسہ کا اصل مقصد اسلامی علوم کی حفاظت ہے، جدید فنون کو داخل کرتے ہوئے اگر اسلام کے علوم آلیہ اور علوم عالیہ کی طرف سے توجہ ہٹتی ہے یا اس میں استعداد کمزور رہتی ہے اور فکر و نظر پر جدید فنون (سائنس، ریاضی، انگریزی اور کمپیوٹر وغیرہ) کا غلبہ اور رجحان رہتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مدرسہ اپنے اصل مقصد سے ہٹ گیا ہے اور صرف یہی کہا جاسکے گا کہ ؎ ایں رہ کہ تو می روی بترکستان است

ہماری ان گذارشات کا حاصل یہ ہے کہ بلاشبہ دینی مدارس میں جدید عصری علوم اور موضوعات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں پیش رفت بھی ہو رہی ہے لیکن اس پیش رفت میں ذکر کردہ پانچ باتوں کا خیال رکھا جائے۔

اول:..... یہ کہ طلبہ کے دل و دماغ کو مرعوبیت سے محفوظ رکھنے کا اہتمام ہو۔

دوم:..... اسلام کی دائمی حقیقتوں سے متعلق فکر و نظر میں تبدیلی نہ آنے پائے۔

سوم:..... اکابر اور اسلاف کے کام اور طریقے کی عظمت اور اہمیت برقرار رہے۔

چہارم:..... جدیدیت میں یہ دلچسپی بقدر ضرورت رکھی جائے اور

پنجم:..... مدرسہ کی محنتوں کا اصل مقصد اور ہدف نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے..... تب تو یہ پیش رفت مفید اور بار آور بنے گی اور امت کے سامنے اس کے اچھے ثمرات آئیں گے، بصورت دیگر یہ ناکام تجربات کی فہرست طویل کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

اصلاحِ معاشرہ

فتویٰ اور تقویٰ

مفتی ناصرالدین مظاہری

[مفتی ناصرالدین مظاہری صاحب نے 1995ء میں مظاہرعلوم وقف سہارنپور سے درسِ نظامی اور 1997ء میں افتاء کی تعلیم مکمل کی، اسی سال مظاہرعلوم وقف سہارنپور میں تدریسی خدمات شروع کی جوتا حال جاری ہیں۔اس کے علاوہ آپ 2002ء سے مظاہرعلوم کے مجلہ ''ماہنامہ آئینہ مظاہرعلوم'' کے مدیر ہیں، آپ کی ادارت میں آئینہ مظاہرعلوم کے چند خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے اور بہت پسند کیے گئے۔ آپ ''بلندو بالاعمارتیں قیامت کی علامتیں''، ''تذکرہ علامہ محمد عثمان غنی''، ''سوانح مفتی مظفرحسین'' سمیت کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کی تحریریں ماہنامہ النخیل کی زینت بنتی رہیں گی، ان شاءاللہ۔ادارہ]

حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے ایک شخص نے مسئلہ معلوم کیا کہ میرے کپڑوں پر ایک درہم سے کم جگہ میں گندگی لگی ہوئی ہے، ایسی صورت میں کیا نماز ہوجائے گی؟ حضرت امام اعظمؒ نے فرمایا کہ نماز ہوجائے گی۔

اس واقعہ کے بعد ایک دفعہ یہی صورت حضرت امام اعظمؒ کے ساتھ پیش آئی تو آپؒ اپنے گھر تشریف لے گئے اور کپڑے بدل کر نماز ادا کی، مذکورہ سائل نے یہ منظر دیکھا تو عرض کیا کہ حضرت آپ نے مجھے ایسا ایسا مسئلہ بتلایا تھا اور یہی کیفیت جب آپ کے ساتھ پیش آئی ہے تو آپ نے کپڑے بدل کر نماز ادا فرمائی ایسا کیوں؟ فرمایا کہ ''میں نے تمہیں جو بات بتائی تھی وہ تو ہے فتویٰ اور تم نے میرا جو عمل دیکھا ہے یہ ہے تقویٰ۔''

اس واقعہ سے عرض یہ کرنا ہے کہ اس وقت عام طور پر مسلمانوں نے فتویٰ کو تو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا

لیکن تقویٰ سے کلی طور پر انحراف اور اعراض برتنا شروع کر دیا حالانکہ جس طرح شریعت مطہرہ میں فتویٰ کا ایک مقام ہے اسی طرح تقویٰ کی بھی اپنی ایک حیثیت ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم جیسے واضح اور کھلے ہوئے ارشادات کے باوجود تقویٰ کے ساتھ ہمارا سوتیلا عمل ایک مجرمانہ حرکت ہے۔

صحیفہ ہدایت قرآن کریم کو اس کی ابتداء ہی میں متقین کی ہدایت کا ذریعہ بتایا گیا اور فرمایا کہ

"ذلك الكتاب لاريب فيه هدىً للمتقين"

اسلام میں تقویٰ اور فتویٰ لازم ملزوم ہیں ،فتویٰ اگر محل ہے تو تقویٰ اس کی چہار دیواری ہے، معروفات کی رغبت و تعمیل کا نام اگر سرچشمہ امانت ہے تو اس کی خلاف ورزی کا نام سرچشمہ فتنہ ہے، منکرات سے بچاؤ کا نام اگر حیاء ہے تو اس کے ارتکاب اور سیہ کاری کے سرچشمہ کو فحش کا نام دیا جائے گا گویا امانت ،فتنہ ،حیاء اور فحش یہ چار قوتیں ہیں جن سے معروف ،منکر ،براور تقویٰ کا تعلق ہے۔ اولین کا تعلق افعال بروخیر کے کرنے اور چھوڑنے سے ہے اور اخیرین کا تعلق متروکات تقویٰ کے ترک اور ارتکاب سے ہے ،فتویٰ پر عمل کے لئے تقویٰ کی حیثیت باڑ اور سرحد کے قائم مقام ہے۔

اسلام کے شیوع اور نشر و شاعت میں تقویٰ کا جو کردار رہا ہے اور دیگر ادیان و مذاہب میں متقی و پرہیز گاروں کو جو عزت و عظمت حاصل ہوئی ہے وہ فتویٰ پر عمل پیرا جماعت سے زیادہ ہے۔

کئی سال ہوئے راقم الحروف سے ایک غیر مسلم نے بڑی صفائی کے ساتھ ایک بات کہی تھی کہ "اگر مسلمان مسلمان بن جائے تو کوئی ہندو ہندو نہیں رہے گا" ایمان اور اسلام کی دولت سے محروم اس شخص کے ان الفاظ کی آپ جس قدر تشریح کرنا چاہیں کریں ،لیکن حقیقت یہی ہے کہ آج اسلام کو مسلمانوں ہی سے زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے اور مسلمان ہی اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔

خورجہ ضلع بلند شہر کی ایک مسجد میں سرکاری بجلی کے وولٹیز کم ہونے کے باعث طے پایا کہ ایک اسٹیب لائزر رکھ دیا جائے ،اس مسجد کے متولی معروف تاجر جناب الحاج رشیق احمد صاحب ہیں، انہوں نے معلوم کیا کہ پہلے یہ تحقیق کرو کہ اسٹیب لائزر کے ذریعہ جو لائٹ ملتی ہے وہ قرب و جوار کے

تاروں سے کشید کی ہوئی ہوتی ہے یا خود اسٹیب لائزر کی پیدا کردہ ہے؟ لوگوں نے غلطی سے بتادیا کہ اسٹیب لائزر از خود لائٹ نہیں بڑھاتا بلکہ قرب وجوار سے کھینچ کر سپلائی کرتا ہے، حاجی رشیق احمد صاحب نے یہ سننے کے بعد مسجد میں اسٹیب لائزر رکھنے سے منع کردیا اور کہا کہ اگر قرب وجوار سے کھینچ کر لائٹ دیتا ہے تو یہ حقوق العباد کی پامالی ہے۔

یہ واقعہ دین بیزاری کے اس ماحول میں سنجیدہ طبقہ کو بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتا ہے، اسی طرح آج عام طور پر اجلاس اور مختلف تقریبات کے اشتہارات بلا اجازت دیواروں اور عمارتوں پر چسپاں کئے جارہے ہیں، بعض مکان مالکان نے باقاعدہ لکھوا بھی رکھا ہے کہ یہاں اشتہار چسپاں کرنا منع ہے اس کے باوجود اشتہار چسپاں کرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا حالانکہ بلا اجازت اشتہارات اور بورڈ کا چسپاں کرنا ناجائز ہے۔

معاشرہ میں ایک اور بیماری یہ پیدا ہوتی جارہی ہے کہ دکانوں کے سامنے سڑکوں کا اچھا خاصا حصہ اپنے تصرف میں لایا جاتا ہے، دوکان کا سامان سڑکوں تک پھیلا دیا جاتا ہے جو سراسر سڑکوں کا ناجائز استعمال ہے اگر حکومت اس سلسلہ میں کوئی کارروائی نہیں کرتی ہے تب بھی سڑکوں کی تنگی کے سبب دوسروں کو ایذاء پہنچتی ہے جو اسلامی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔

ہمارے استاذ حضرت مولانا اطہر حسین نوراللہ مرقدہ (متوفی ۱۴۲۸ھ) نے مظاہر علوم کی تدریسی زندگی کا اکثر حصہ مدرسہ قدیم کی مسجد اولیاء کے ایک گوشہ میں چٹائی پر بیٹھ کر گزارا ہے، ان کا معمول تھا کہ جب تک سبق ہوتا پنکھا چلتا رہتا اور سبق ختم ہوتے ہی پنکھا بند کرادیتے، پوچھنے پر فرماتے کہ یہ پنکھا مال وقف ہے اور مال وقف سے ذاتی فائدہ اٹھانا غلط ہے۔ (واضح رہے کہ یہ مسجد مدرسہ ہی کے زیر انتظام ہے۔)

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت والاؒ نے راقم کو ایک کتاب مستعار پڑھنے کے لئے مرحمت فرمائی احقر نے حسب وعدہ کتاب پڑھ کر واپس کردی اور واپسی کے وقت یہ بھی عرض کردیا کہ حضرت! یہ کتاب بہت ہی عمدہ محسوس ہوئی میں نے اس کی فوٹو کاپی کرالی ہے، فرمایا: تم نے غلط کیا بلا اجازت

کتاب کی نقل کرنا اور فوٹو کاپی کرانا بھی صحیح نہیں ہے، پھر فرمایا کہ آج کل مصنفین وناشرین کی کتابیں ان کی اجازت کے بغیر شائع کرنے کا چلن عام ہو چکا ہے جو غلط ہے۔

ہمارے ایک دوست محمد شاداب جو کمپیوٹر انجینئر ہیں انہوں نے سہارنپور کے ''رادھا سوامی ست سنگ بیاس'' نامی غیر مسلم فرقہ کے بارے میں بتایا کہ اس فرقہ کی سہارنپور شاخ کے ایک دفتر میں کمپیوٹر سسٹم رکھا گیا اس سلسلہ میں مجھ سے خدمات لی گئیں، دفتر کے انچارج نے کمپیوٹر سافٹ ویر سے متعلق مجھ سے معلوم کیا کہ فلاں فلاں سافٹ وئیر آپ کے پاس ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں موجود ہیں، انچارج نے پھر پوچھا کہ اصلی ہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں بلکہ میرے پاس جو پروگرام ہے اس کی دوسری کاپی کر کے لوڈ کر دوں گا۔ انچارج نے نقلی پروگرام خریدنے سے صاف منع کر دیا اور کہا کہ ''ان کمپیوٹروں کے ذریعہ دھارمک کام ہوں گے اور دھارمک کاموں میں نقلی پروگرام لوڈ کرنا یقیناً غلط ہے چنانچہ اصل سافٹ وئیر ہی خریدے گئے۔

یہ واقعات تحریر کرنے سے ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ مسلمان بحیثیت مسلمان خود کو پہچانے، اس کی وہ خوبیاں جن کو غیروں نے اختیار کر کے حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں، اسلام کی وہ شبیہ جو ہمارے کردار وعمل سے داغدار ہو رہی ہے اس میں شفافیت لائی جائے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی ''یاایھا الذین آمنوا آمنوا'' کے قالب میں خود کو ڈھال لیں اور ''حاسبوا قبل ان تحاسبوا'' کی عملی تصویر بنالیں پھر وعدۂ الٰہی **ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب** کا بچشم خود مشاہدہ کریں۔

آج عام طور پر حرام ومشتبہ مال سے احتیاط میں ہم سے مجرمانہ غفلت سرزد ہو رہی ہے وہ انتہائی افسوسناک اور قابل مذمت ہے، سوچنے کی بات ہے کہ مشکوک مال سے پرہیز کرنے میں ہمارا کیا کردار ہے؟ بیع وشرائ، تجارت وزراعت، صنعت وحرفت اور ملازمت ہر میدان میں ہم نے تقویٰ کو کس طرح پس پشت ڈال رکھا ہے اس کا محاسبہ اور احتساب ہم نہیں کر رہے ہیں، آموں کے باغات سے لے کر گنے کے کھیت تک ساری فصل آج کے دور میں قبل از وقت بیچ دی جاتی ہے حالانکہ بیع

معدوم جائز ہی نہیں ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ کے تم سے حساب لینے سے پہلے پہلے تم اپنا محاسبہ کرلو اس سے اللہ پاک کا حساب آسان ہوجائے گا اور اعمال نامے کے تولے جانے سے پہلے پہلے تم اپنا موازنہ کرلو'' (حیاۃ الصحابۃ)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے تقویٰ وطہارت سے کون ناواقف ہوگا، آپؓ نے ٹیکس وصول کرنے والے کے کنویں سے پانی اور اس کے مکان کے سایہ میں بیٹھنے سے بھی منع فرمایا ہے'' (ابن عساکر)

ناپ تول میں کمی کو آج تجارت کی معراج سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچائی اور امانت داری کے ساتھ کاروبار کرنے والوں کو انبیاء، صدیقین اور شہداء کی صف میں کھڑے ہونے کی بشارت دی ہے۔ التاجر الصدوق الامین مع النبیین و الصدیقین و الشھداء۔

ملازمین حضرات مفوضہ امور میں کوتاہی اور کاہلی کو معمول بنا بیٹھے، وقت پر نہ آنا اور وقت سے پہلے چلے جانا عام بات ہوگئی، وقت کے دوران بھی فضولیات میں مشغول رہنے کو عادت بنالیا گیا اور منتظم کے عفوودرگزر سے ناجائز فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ نے ''معارف القرآن'' میں سورۂ تطفیف کی تفسیر اور تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

> ''اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقررہ حق سے کم کرتا ہے وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے، مزدور ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے اس میں سے وقت چرانا اور کم کرنا بھی اس میں داخل ہے، وقت کے اندر جس طرح محنت سے کام کرنے کا عرف میں معمول ہے اس میں سستی کرنا بھی تطفیف ہے، اس میں عام لوگوں میں یہاں تک کہ اہل علم میں بھی غفلت پائی جاتی ہے، اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا''۔ **اعاذنا اللہ منہ**
>
> (معارف القرآن ص ۶۹۴ جلد ۸ مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مبارک دور میں ان کی خانقاہ کے مدرسہ میں

ہر استاذ اور ملازم کے پاس ایک رزنامچہ رکھا رہتا تھا مثلاً ایک استاذ ہے اور اس کو چھ گھنٹے سبق پڑھانا ہے، سبق کے دوران کوئی مہمان ملنے کے لئے آ گیا تو جس وقت مہمان آتا استاذ اپنے روزنامچے میں مہمان کے آنے کا وقت لکھ لیتا اور جب جاتا تو جانے کا وقت بھی لکھ لیتا، پورے مہینہ یہ سلسلہ چلتا اور اخیر مہینہ میں جب تنخواہ ملتی تو استاذ دفتر میں ایک درخواست دیتا کہ اس مہینہ میں میرے پاس اتنے مہمان آئے اور ملاقات میں اتنا وقت لگا اس لیے اتنی دیر کی تنخواہ وضع کر لی جائے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ایک دفعہ جمعیۃ علماء ھند کی مسجد میں نئی چٹائیاں بچھی ہوئی دیکھ کر ناظم اعلیٰ حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کے حسن انتظام کی تعریف فرمائی، کسی نے عرض کیا کہ یہ انتظام ناظم اعلیٰ کا نہیں ہے بلکہ آپ کے خادم چودھری عبدالرحمن کی عقیدت ہے جو کہ چٹائیاں فروخت کرتے ہیں، انہوں نے اس وقت فروخت کی چٹائیاں بچھا دی ہیں۔ حضرت مدنیؒ نے یہ سنتے ہی چٹائیاں اٹھوا دیں اور فرمایا کہ عبدالرحمن اِن چٹائیوں کو غیر مستعمل اور نئی بتا کر فروخت کرے گا، حالانکہ استعمال میں آ چکی ہوں گی، لہٰذا یہ کب درست ہوگا؟۔

(الجمعیۃ: شیخ الاسلام نمبر ص ۳۰۵)

حضرت مدنیؒ نے دارالعلوم دیوبند کی تدریسی خدمات کے دوران کبھی استحقاقی رخصتوں کی تنخواہ نہیں لی، اسی طرح ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا اطہر حسینؒ نے بھی کبھی استحقاقی رخصتوں کا مشاہرہ نہیں لیا، فقیہ الاسلام حصرت مولانا مفتی مظفر حسینؒ اور حضرت مولانا علامہ محمد یامین سہارنپوریؒ کا یہ ایک مستقل معمول تھا کہ تنخواہ ملنے پر ''کوتاہی ملازمت'' کے نام سے کچھ رقم مدرسہ کو واپس کر دیا کرتے تھے، الغرض! ان حضرات کے حزم واحتیاط، تقویٰ وتدین اور زہد وورع کو دیکھ اور پڑھ کر صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ۔

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری
یہ آشیاں کسی شاخ چمن پر بار نہ ہو

ہمارے اکابر نے تقویٰ وتدین کے سلسلہ میں اپنے کردار وعمل کی خوشبو سے اپنے زمانہ کو معطر ومعنبر کردیا تھا، مشکوک کھجور کھالینے پر نیند کا نہ آنا، مشتبہ لقمہ کھا کر زبردستی قے کر دینا، مدرسہ کے اوقات میں ذاتی کام سے احتیاط، مال وقف سے پرہیز، کوتاہی ملازمت کی تلافی، اوقات مدرسہ میں مدرسہ کی دری اور چٹائی پر بیٹھ کر مہمانوں سے بھی ملاقات نہ کرنا، ذاتی کام میں مدرسہ کے قلم اور کاغذ، بجلی وروشنائی کے استعمال سے بچتے رہنا، یہ جاننے کے بعد کہ آموں کی خرید وفروخت شریعت کے تقاضہ اور منشاء کے خلاف ہورہی ہے آموں کا کھانا ہی بند کر دینا، بکری کا بچہ چوری ہوجانے کی اطلاع پاکر گوشت کھانا چھوڑ دیا، قرض دار کی دیوار کے سایہ سے بھی محتاط رہنا، خریدار کے سامنے اس بات کی بھی وضاحت ضروری سمجھنا کہ یہ سوت سورج کی روشنی میں کاتا گیا ہے اور یہ سوت چاند کی روشنی میں غرض اس قسم کے ہزاروں واقعات ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

جب تک سیرت وسنت اور شریعت وطریقت کو دل وجان سے نہ لگالیں کامیابی ہمارے قدم نہیں چوم سکتی، فلاح وکامرانی ہمارے لئے چشم براہ نہیں ہوسکتی اور دنیوی واخروی نقصان وخسران سے ہم نہیں بچ سکتے، ہمیں اپنا یہ معمول اور عادت بنالینی ہوگی کہ ہم ایسے رزق اور غذا سے بچیں جس غذا سے ہماری پرواز میں کوتاہی، ہمارے افکار میں گندگی اور ہمارے شعور ووجدان میں پراگندگی پیدا ہو۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

☆......☆......☆

علم و تحقیق

ہندوستان میں علم حدیث

حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی

[حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی قدس سرہ نے مظاہر علوم سہارنپور سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیو بند سے دورہ حدیث کیا۔ ریاست ٹونک میں بحیثیت قاضی و مفتی مقرر ہوئے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان تشریف لائے۔ دارالعلوم نانک واڑہ (کراچی) اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں تدریسی خدمات سرانجام دیں اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کے بعد مفتی اعظم پاکستان کے لقب سے نوازے گئے۔ 3 فروری 1995ء کو وصال ہوا۔ آپ کا ایک مضمون نذرِ قارئین ہے۔ ادارہ]

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ۹۳ھ میں مسلمانوں نے سندھ پر حملہ کیا اور اسے فتح کیا اور یہ ملک اس وقت سے تیسری صدی ہجری کے شروع تک عربوں کے قبضہ میں رہا۔ اس طویل عرصے میں سندھ میں تابعین، اس سرزمین کو اپنے شرف قدوم سے زینت بخشتے رہے اور بعض نے یہیں سکونت اختیار کی اور یہیں دفن ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سارا عالم اسلام قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گونج رہا تھا۔ اس لیے ناممکن تھا کہ سرزمین سندھ میں اس کی صدائے بازگشت سنائی نہ دے، چنانچہ اس عرصے میں جو محدثین اور رواۃ حدیث مشہور ہوئے یا جن کے اسمائے گرامی تاریخ نے محفوظ رکھے، وہ یہ ہیں:

۱:... اسرائیل بن موسیٰ البصری نزیل الھند ۲:... منصور بن حاتم النحوی ۳:... ابراھیم بن محمد الدیبلی ۴:... احمد بن محمد المنصوری ۵:... ابو العباس، قاضی المنصورۃ، مؤرخ

الذکر نے امام داؤد ظاہری کے مذہب پر کچھ کتابیں بھی لکھیں۔ ۶:... خلف بن محمد الدیبلی ۷:... شعیب بن محمد الدیبلی ۸:... ابو محمد عبداللہ المنصوری ۹:... علی بن موسیٰ الدیبلی ۱۰:... فتح محمد عبداللہ السندی ۱۱:... محمد بن ابراھیم الدیبلی

(الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند، ص ۱۳۶)

پھر اس سرزمین کو اسی دور میں ایک محدث سے بھی شرف حاصل ہوا، جن کا نام ربیع بن صبیح السعدی البصری ہے، جن کو تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا اور جو بزمانہ مہدی خلیفہ عباسی فوج کے ایک سپاہی کی حیثیت سے سرزمین سندھ میں داخل ہوئے تھے اور جنہوں نے واپسی پر وفات پائی تھی۔

ربیع بن صبیح کے متعلق صاحب کشف الظنون کا بیان ہے: ”قیل ھو اول من صنف و بوب فی الاسلام“ ترجمہ: ”کہا گیا کہ یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام میں تصنیف فرمائی۔“

طبقات ابن سعد میں ہے: ”خرج غازیا الی الھند فی البحر فمات فدفن فی جزیرۃ من جزائر البحر سنۃ سنین و مائۃ“ ترجمہ: ”وہ غزا کے لئے ہندوستان میں گئے تو وہاں انتقال کیا اور کسی جزیرہ میں ۱۶۰ھ میں دفن ہو گئے۔ (ہندوستان میں علم حدیث مقالات سید سلیمان ندوی)

ان کے علاوہ حباب بن فضالہ تابعی، اسرائیل بن موسیٰ تبع تابعی، ابو معشر نجیح سندھی، رجاء السندھی کے نام بھی اس دور میں ملتے ہیں۔ (مقالہ مذکور)

عرب حکومتوں کا دور ختم ہو گیا۔ اب دوسرا دور شروع ہوا جس میں اسلام خشکی کے راستے سے ترکوں، پٹھانوں، مغلوں اور ایرانیوں کے ذریعے داخل ہوا۔ یہ زمانہ چوتھی صدی کے آخر سے دسویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ دور علم حدیث کے لیے خزاں کا دور تھا۔ منطق، فلسفہ، کلام، فقہ اور اصول فقہ کی تدریس جاری تھی لیکن حدیث کی تعلیم سے بے اعتنائی اس دور کی خصوصیت رہی۔ اگر حدیث پڑھنے کا کسی کو شوق ہوتا تو صرف علامہ صغانی بدایونی ثم اللاہوری کی کتاب مشارق الانوار پڑھتا یا زیادہ سے زیادہ بغوی کی کتاب مصابیح یا مشکوۃ المصابیح زیر درس رہتیں۔ ان کو صرف تبرک کے لئے پڑھایا جاتا۔ مولانا حکیم عبدالحیٔ صاحب اس دور کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

''عرب حکومت جب سندھ سے ختم ہوگئی اور غزنوی اور غوری بادشاہوں کا دور شروع ہوا، خراسان اور ماوراء النہر سے لوگ آنے شروع ہو گئے تو علم حدیث اس دیار میں کبریت احمر اور عنقا کی طرح ہوگیا اور لوگوں پر، شعر، نجوم، فنون ریاضیہ نے غلبہ پالیا، علوم دینیہ میں صرف فقہ اور اصول فقہ پر اختصار کیا گیا اور اس پر ایک طویل عہد گزر گیا۔ اہل ہند کی تگ ودو کا محور یونانی فلسفہ اور منطق بن گیا، علوم قرآن وسنت سے انحراف ان کا شیوہ ہوگیا، فقہ واصول فقہ بھی دوسرے علوم کے مقابلہ میں قلیل تھا، حدیث میں ان کی نگاہ صرف صغانی کی مشارق الانوار یا زیادہ سے زیادہ بغوی کی مصابیح، مشکوۃ المصابیح کی طرف جاتی تھی اور جو ان کتابوں کو پڑھ لیتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ وہ محدثین کے درجہ تک پہنچ گیا۔ یہ صرف علم حدیث سے جہالت کا نتیجہ تھا۔ اس لئے اس دور کی کتابوں میں حدیث کا ذکر تک نہیں ملتا، یہ لوگ نہ حدیث پڑھتے تھے اور نہ اس کی تعلیم وتدریس کی طرف لوگوں کو آمادہ کرتے تھے اور نہ محدثین کو جانتے تھے۔ تھوڑے لوگ جو مشکوۃ وغیرہ پڑھتے تھے وہ بھی برکت کے لئے، فہم کے لئے نہیں۔

(''الثقافة الاسلامیہ فی الھند'' ص ۱۳۶ و ''ابجد العلوم'')

دسویں صدی کا اخیر علم حدیث کے لئے بڑا خوش آئند تھا کہ اس زمانہ میں حدیث کے علماء ہندوستان کے بعض علاقوں میں اسلامی دنیا سے وارد ہوئے اور حدثنا و اخبرنا کی صدائے عطر بیز گونجنے لگی، جس سے ہندوستان معطر ہوگیا، مثلاً شیخ عبدالمعطی بن الحسن بن عبداللہ المکی المتوفی باحمد آباد ۹۸۹ھ۔ شہاب احمد بن بدرالدین المصری المتوفی باحمد آباد ۹۹۲ھ، شیخ محمد بن احمد بن علی الفاکہی الحسینی المتوفی ۹۹۲ھ۔ شیخ محمد بن محمد عبدالرحمٰن المالکی المصری المتوفی باحمد آباد ۹۱۹ھ، شیخ رفیع الدین الچشتی الشیرازی المتوفی باکبر آباد ۹۵۴ھ، شیخ ابراہیم بن احمد بن الحسن البغدادی، شیخ ضیاء الدین المدنی المدفون بکاکور، شیخ بہلول بدخشی، خواجہ میر کلاں ہروی المتوفی ۹۸۱ھ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اسی دور میں بعض علمائے ہند نے حرمین شریفین کا علمی سفر اختیار کیا اور علوم سنت وحدیث سے آراستہ ہوکر ہندوستان واپس ہوئے اور یہاں درس وافادہ کی مجلسیں آراستہ اور گرم ہوئیں۔ ان میں چند حضرات کے نام یہ ہیں:

شیخ عبداللہ سعد اللہ السندیؒ، شیخ رحمت اللہ بن عبداللہ بن عبدالرحیم السندیؒ، شیخ یعقوب بن الحسن کشمیریؒ، شیخ جویر کشمیری، شیخ محمد بن طاہر فتنیؒ صاحب مجمع البحار، مؤخر الذکر نے حدیث میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ مجمع البحار، المغنی، التذکرہ فی الموضوعات آپ کی یادگار کتابیں ہیں۔ شیخ محمد طاہر کے استاذ اور شیخ علی متقی الگجراتی نے بھی حجاز کا سفر اختیار کیا تھا اور وہاں کے مشہور ومعروف اساتذہ حدیث سے علم ظاہر وباطن کی تحصیل کی تھی۔ کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال جیسی دائرۃ المعارف علم حدیث میں تصنیف فرمائی، جس نے اس نوع کی بہت سی کتابوں پر خط تنسیخ پھیر دیا۔ موصوف کی مشہور ومعروف کتاب کا زمانی ترتیب ۹۵۷ھ سے ۹۷۱ھ تک بتلایا جاتا ہے۔

دسویں صدی کے آخر میں ایک محدث سید عبدالاول الحسینی المتوفی ۹۶۸ھ کا نام بھی ملتا ہے۔ یہ ہندوستان میں صحیح بخاری کے سب سے پہلے شارح ہیں۔ ''فیض الباری'' کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی اور فیروز آبادی کی سفر السعادۃ کا خلاصہ کیا۔

(ہندوستان میں علم حدیث مقالات سید سلیمان ندوی)

گیارہویں صدی کے آخر میں علم حدیث کا ایک ماہتاب شیخ عبدالحق البخاری الدھلوی المتوفی ۱۰۵۲ھ کے نام سے چمکا، جس نے اکبر کے دور بدعت، الحاد، زندقہ کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور سے ختم کردیا۔ شیخ نے حدیث کی خدمت کی، مشکوٰۃ المصابیح کی دو شرحیں لکھیں۔ ''لمعات التنقیح'' عربی میں اور ''اشعۃ اللمعات'' فارسی میں اور ہندوستان میں عمومی طور پر حدیث کو غور وفکر اور تدبر ومعانی سے پڑھنے پڑھانے کا رواج دیا۔ شیخ کے صاحبزادوں اور شاگردوں نے بھی خدمت علم حدیث کو اپنا موضوع بنایا۔ تیسیر القاری شرح شیخ الاسلام، محلیٰ حدیث میں ان کی یادگار تصانیف ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد بن عبدالاحد السرہندی کا نام نامی بھی بہ ضمن خادمان حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہندوستان کی تاریخ میں جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ حضرت کے صاحبزادے خواجہ محمد سعید رحمۃ اللہ علیہ نے مشکوٰۃ المصابیح کی شرح لکھی۔ حضرت محمد سعید کے صاحبزادے فرخ شاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کو ۷۰ ہزار حدیثیں متن، سند اور جرح وتعدیل کے مباحث کے

ساتھ یاد تھیں۔ (الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند ص ۱۳۸)

سلسلہ مجددیہ کے ایک اور فرد شیخ سراج احمد سرہندی بھی ہیں، جنہوں نے فارسی زبان میں جامع ترمذی کی فاضلانہ مگر مختصر شرح لکھی اور امام ترمذی "فی الباب" کے عنوان سے جن احادیث کی طرف اشارہ اجمالی کرتے ہیں، ان کی تخریج کی، صاحب تحفۃ الاحوذی مبارک پوری کا مآخذ اس سلسلے میں یہی کتاب مستطاب ہے۔ (شروع اربعہ کے نام سے والی کوٹک نواب محمد علی خاں کے علم دوستی کی بناء پر یہ کتاب چھپی تھی، کتب خانہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ میں اس کی دو جلدیں موجود ہیں۔)

ہندوستان میں علم حدیث کی تاریخ اپنے مراحل طے کررہی تھی اور مختلف علاقوں میں محدثین اور اصحاب حدیث خدمت حدیث انجام دے رہے تھے لیکن حدیث کا علم ابھی خواص بلکہ اخص الخواص کا موضوع سخن تھا کہ علم حدیث کی تاریخ میں ایک انقلاب آتا ہے یعنی حضرت شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ سریر آرائے مسند حدیث ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے ہندوستان میں متداول علوم کی تحصیل کے بعد سفر حجاز اختیار کیا۔ شیخ ابوطاہر ابن ابراہیم الکورانی سے صحاح ستہ کا درس لیا۔ شیخ ابوطاہر بھی اپنے اس ہندی شاگرد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ برملا کہنے لگے: "یہ مجھ سے لفظ حدیث کی تصیح کرتے ہیں، اور میں ان سے معانی حدیث کی تصحیح کرتا ہوں۔" ان کے خاندان میں حافظ ابن حجر کے علوم اور ان کی کتابیں موجود تھیں۔ شیخ نے اپنے سارے علوم اپنے ہونہار شاگرد کے سامنے کھول دیئے۔ حضرت شاہ صاحب بار بار فرماتے "اقرأنی ابو طاهر نجط ابن حجر۔" شاہ صاحب نے کتاب الام للشافعی اور دیگر کتب شافعیہ مطالعہ کیں۔ جب واپس لوٹے تو شافعیت سے خاصے متاثر تھے۔ حضرت شاہ صاحب نے ہندوستان آکر مشکوٰۃ المصابیح کے درس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ صحاح ستہ کا درس شروع کیا اور ظلمت کدہ ہند، حدیث نبوی کے نور سے منور ہوگیا۔

حضرت شاہ صاحب نے حدیث میں تفقہ فی الحدیث اور اسرار وحکم کا ایک نیا باب کھولا، خطابی شرح حدیث میں اور علامہ طیبی بلاغت حدیث کے ذیل میں اور امام غزالی مہلکات ومنجیات کے ضمن

میں اور مہائمی تصوف اور اشارات کی زبان میں بیان کرتے تھے لیکن اس کو مستقل فن بنا دینا اور اس کے ذریعے قرآن وحدیث کی علمی مشکلات حل کرنا شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزندان گرامی کا حصہ ہے۔اسی طرح تعلق مع اللہ اور صفاء باطن کے ذریعہ علوم نبوت کا حل تلاش کرنا بھی اسی جماعت کا خاصہ ہے۔مولانا حکیم عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

”وحصل له الفتح العظيم فى التوحيد والجانب الواسع فى السلوك ونزل على قلبه العلوم الوجدانيه فوجا فوجا وخاض فى بحار المذاهب الاربعة واصول فقههم خوضا بليغا ونظرا فى الاحاديث التى هى متمسكاتهم فى الاحكام وارتضىٰ من بينها بامداد النور الغيبى طريق الفقهاء المحدثين“

ترجمہ:”حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو توحید میں فتح عظیم اور سلوک میں حصہ وافر حاصل ہوا اور وجدانی علوم،گروہ در گروہ ان کے قلب پر نازل ہوئے۔مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ کے سمندر میں غوطہ زن ہوئے اور ان احادیث میں غور وفکر کیا جو ان کے احکام میں ان ادلہ ہیں اور نور باطن کی مدد سے فقہا محدثین کا طریقہ پسند کیا۔“

(نزهة الخواطر، ج٦ص ٣٩٩)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی بے نظیر تفسیر فتح العزیز کے دیباچہ میں بطور تواضع فرماتے ہیں:

”هر چند استعداد بلند فطرت ارجمند وقدرت معنی آفرینی وقوت خیال گزینی وربطی بمبدأ فیاض و دلی بقواعد تصفیہ مرتاض۔“(تفسیر فتح العزیز پارہ اول) ترجمہ:......باوجود اس کے کہ کامل استعداد اور فطرت بلند اور معنی پیدا کرنے کی قدرت اور اللہ تعالیٰ سے تعلق اور صفاء باطن نصیب نہ تھا لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوا کہ ان حضرات کے نزدیک قرآن وحدیث کے فہم کے لئے تعلق مع اللہ اور صفاء باطن ضروری ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی گوناگوں خصوصیات کے حامل آپ کے بعد آپ کے فرزند گرامی ہوئے جن میں مسند وقت حضرت شاہ عبدالعزیز کا نام نامی سرفہرست ہے۔حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب

رحمۃ اللہ علیہ کا لقب سراج الہند اور حجۃ اللہ ہے۔ مولانا حکیم عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ آپ کا تذکرہ اس طرح شروع کرتے ہیں:

"الامام العالم الکبیر العلامہ المحدث عبد العزیز ابن ولی اللہ بن عبد الرحیم العمری الدھلوی سید علمائنا فی زمانہ ابن سیدھم"

(نزھۃ الخواطر ج۷ ص ۲۶۸)

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسے کمالات عطا کئے تھے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تفسیر فتح العزیز کے دیباچہ میں جن صفات کی تواضعاً نفی فرمائی ہے، وہ سب صفات آپ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ صاحب "الیانع الجنی" لکھتے ہیں:

"انہ قد بلغ من الکمال و الشھرۃ بحیث تری الناس فی مدن اقطار الھند یفتخرون باعتزائھم الیہ و انسلاکھم فی سمط من ینتمی الیٰ اصحابہ"

"حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کمال اور شہرت کے اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ ہندوستان کے مختلف اہل شہر، ان کی طرف نسبت اور ان کے شاگردوں کے زمرہ میں شامل ہونے پر فخر کرتے تھے۔"

(الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی)

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث اپنے والد ماجد صاحب سے پڑھی، والد ماجد کی وفات کے بعد شیخ نور اللہ بڑہانوی اور شیخ محمد امین کشمیری سے کچھ کتابیں حدیث کی پڑھیں۔ شیخ محمد عاشق بن عبید اللہ پھلتی نے اجازت دی۔ مؤخر الذکر حضرت شاہ ولی اللہ کے اجلہ تلامذہ میں سے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے عامی کے لئے تقلید مذہب معین کو ضروری قرار دیا اور مذہب حنفی کو اختیار کیا۔ مذہب حنفی کے کچھ قواعد کی تشریح کی اور واضح طور پر تحریر فرمایا کہ حنفیہ احادیث کلیہ جو بطور قواعد وارد ہوئی ہیں، ان کی حفاظت کرتے ہیں اور جو ان کے خلاف بطور جزئیات وارد ہوئی ہیں، ان کی تاویل کر دیتے ہیں یا شاذ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح تلفیق بین المذاہب کی ممانعت کی، اجتہاد کے لئے کڑی شرطیں عائد کیں۔

(فتاویٰ شاہ عبدالعزیز اردو ترجمہ ص ۳۸۹ و ۴۰۲)

راقم آثم کو یاد پڑتا ہے کہ کہیں حضرت نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کسی نے پوچھا کہ فرق میان مذہب حنفی وشافعی چیست؟ گفت مذہب حنفی کلی است، ومذہب شافعی جزئی است۔ یعنی دونوں مذہبوں میں فرق یہ ہے کہ مذہب شافعی جزوی ہے اور مذہب حنفی کلی ہے۔ حضرات شوافع جزئیات سے متاثر ہوکر احادیث کلیہ میں ترمیم اور استثناء کرتے رہتے ہیں۔ البتہ حنفیہ احادیث کلیہ کی حفاظت کرکے جزئیات میں تاویل کردیتے ہیں۔ اس طرح حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کو عدم تقلید اور تلفیق بین المذاہب کے فتنے سے بچالیا۔ عدم تقلید سلف کے ساتھ بے ادبی، گستاخی کبھی انکار حدیث، بلکہ الحاد اور زندقہ کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی شہادت منکرین حدیث کی تاریخ سے مل سکتی ہے جو زیادہ تر غیر مقلد تھے۔ تلفیق بین المذاہب کا نتیجہ اتباع ہویٰ کے سوا کچھ نہیں۔

حضرت مولانا بنوری قدس اللہ سرہ العزیز حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے مداح تھے بار بار اپنے دروس اور مجالس میں فرمایا کرتے تھے:

> ''اگر کسی شخص کو آنکھیں بند کرکے مقتدیٰ اور امام بنایا جاسکتا ہے تو وہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ہیں کیونکہ موصوف علم ظاہر و باطن کے جامع اور فقہ وکلام میں مسلک اعتدال پر عامل تھے۔''

ایک صاحب مصر کی الازہر یونیورسٹی سے علوم قرآنی میں تخصص کرکے آئے تو ان سے دریافت کیا کہ نسخ کی مختلف صورتوں کی حکمت پر روشنی ڈالئے۔ جب وہ عاجز ہوئے تو فرمایا:

> ''حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف صورتوں کی حکم ومصالح اس طرح تحریر فرمائی ہیں کہ کہیں کسی کتاب میں دیکھنے میں نہیں آئیں۔''

اپنے شیخ حضرت انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں:

> ''حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر فتح العزیز مکمل ہوجاتی تو کسی تفسیر کی حاجت نہیں رہتی۔''

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے ''الابواب والتراجم'' کے متعلق

فرمایا کرتے تھے:

''اگر اس طرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ توجہ فرماتے تو حق ادا ہو جاتا۔''

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کے برادران جلیل الشاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور ایک عالم نے علوم حدیث حاصل کئے۔ حضرت شاہ محمد اسحق نے جو اپنے زمانے میں مسند وقت تھے، حدیث حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی اور طویل عرصہ تک ساتھ رہے۔ حضرت شاہ محمد اسحق کے متعلق مولانا حکیم عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ رقم فرما ہیں:

''انتهت اليه رياسة الحديث فی الهند'' ترجمہ: ''حضرت شاہ محمد اسحق پر علم حدیث کی ریاست ختم ہوگئی۔'' حضرت شاہ محمد اسحق رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مدنی المتوفی ۱۲۹۶ھ مسند وقت تھے، شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک جہان فیض یاب ہوا۔

خاندان ولی اللہی کے بعد حق وصداقت، علم وعرفان، صدق وصفا، علوم دینیہ خصوصاً قرآن کریم و حدیث نبوی کی تعلیم وتدریس اور درس وافادہ کی خلافت حضرات علماء دیوبند وسہارنپور کی طرف منتقل ہوئی۔ حضرات علماء دیوبند وسہارنپور نے سو سال تک تجدید کا کام کیا ہے اور جیسا کہ ہم نے تمہید میں لکھا تھا کہ اس جماعت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصد نبوت و بعثت کو بدرجہ اتم پورا فرمایا۔ بہ سلسلہ علومِ حدیث اس جماعت میں سرفہرست محدث کبیر، فقیہ بے عدیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز نے حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی، حضرت گنگوہی آیۃ من آیات اللہ تھے۔ آپ کے متعلق مولانا حکیم عبدالحئی لکھتے ہیں:

''منهم الشيخ رشيد احمد الگنگوهی المتوفی ۱۳۲۳ھ اخذ عن الشيخ عبد الغنی المذكور و درس ثلاثين سنة و كان تدريسه للامهات الست فی سنة كاملة علی وجه التدبر والاتقان والضبط والتحقيق لا يعاد له فی ذلك احد من معاصريه'' (الثقافة الاسلاميه فی الهند)

ترجمہ: ''شیخ رشید احمد گنگوہی المتوفی: ۱۳۲۳ھ آپ نے حدیث حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ

سے پڑھی اور ۳۰ سال تک حدیث کا درس دیا۔ ایک سال میں صحاح ستہ کا درس دیا کرتے تھے، کامل غور وفکر، پختگی اور تحقیق کے ساتھ، ان کے معاصرین میں سے کوئی بھی ان کے ہم پلہ نہیں تھا۔‘‘

حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے حضراتِ ذیل فیض یاب ہوئے :۱:......حضرت مولانا خلیل احمد رحمۃ اللہ علیہ المہاجر مدنی شارح ابی داؤد۔ ۲:......حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔ ۳:......حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ ۴:......حضرت مولانا محمد صدیق الانبٹھوی رحمۃ اللہ علیہ۔ ۵:......شاہ محمد یسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نگنیوی۔ ٦:......حضرت مولانا محمد یحیی کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ والد ماجد شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مدظلہ۔ (مقدمہ لامع الدراری)

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف خصوصاً بہ سلسلہ علم حدیث کے باقی رکھنے کا سہرا حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی کے سر پر ہے کہ آپ نے بخاری وترمذی کی تقاریر قلمبند فرمائیں۔ پھر آپ کے نجل مسعود حضرت شیخ الحدیث مدظلہ العالی نے ان کی ایضاح وتوضیح اور شرح وتخریج کے ساتھ شائع کیں۔ الکوکب الدری دو جلدوں میں اور لامع الدراری شرح البخاری دس جلدوں میں ترتیب دی، علوم رشیدی کے یہ جواہر ریزے محفوظ ہو گئے۔ علماء حدیث کے اساتذہ وطلبہ ان دونوں حضرات کے احسان علمی کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تفقہ فی الحدیث کا جو پودا لگایا گیا تھا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے تناور درخت بنا دیا۔ اسی طرح نور باطن اور تعلق مع اللہ سے حدیث سمجھنے کا سلسلہ حضرت گنگوہی پر ختم ہو گیا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے فقاہتِ نفس سے سرفراز فرمایا تھا۔ مسلک حنفی کو ادلہ حدیث سے ثابت کرنا اور جو حدیث بظاہر مخالف نظر آئے، اس کا جواب دینا، حضرت گنگوہی نے اس فریضہ کو کامیابی سے ادا کیا۔ اس کے علاوہ فقہاء نے حنفیہ متاخرین کی تفصیلات جو حدیث کے خلاف تھیں، ان کی فقہ حنفی سے برآت کی، علاوہ ازیں فقہ میں توسع اور تضیق کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی۔ شراح حدیث: ابن بطال، مہلب، ابن التین، ابن المنیر ،قاضی عیاض، خطابی، ابن حجر، عینی رحمہم اللہ سے بہتر احادیث کی شرح کی۔ الکوکب الدری اور لامع الدراری میں اس

کی بے شمار مثالیں ہیں۔ خصوصاً لامع میں حل تراجم کے سلسلے میں حضرت گنگوہی کی ایسی توجیہات ہیں کہ عقل حیران ہے۔ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہم اللہ تعالیٰ کی توجیہات سے فائق ہیں۔ یہ مضمون فرصت کا متقاضی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت موصوف کے علوم و جواہر ظاہر کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ تعالیٰ حضرت گنگوہی کی فقاہت نفس کا بار بار اظہار فرمایا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث پڑھی اور دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت پر رونق افروز ہوئے۔ حضرت شیخ الہند سے ایک عالم فیض یاب ہوا۔ جن میں حضرت مولانا محمد انور شاہ الکشمیر ی ثم الدیوبندی خصوصیات کے حامل ہیں۔

☆......☆......☆

حاصِلِ سیرِ بے دِلاں کون ومکاں نہیں نہیں　　کُوے حرم نہیں نہیں شہرِ بُتاں نہیں نہیں
جسم کی رَسمیات اَور دل کے معاملات اَور　　بیعَتِ دست ہاں ضرور بیعَتِ جاں نہیں نہیں
درد کی کچھ بساط ہے جس پہ یہ پیچ وتاب ہو　　دیکھ عزیز! صبر صبر دیکھ مِیاں ! نہیں نہیں
ہم فُقَرا کا نام کیا پھر بھی اگر کہیں لِکھو　　لَوحِ زمیں تو ٹھیک ہے لَوحِ زماں نہیں نہیں
دونوں تباہ ہو گئے ختم کرو یہ معرکے　　اہلِ سِتم نہیں نہیں دِل زدَہ گاں نہیں نہیں
گرمیِٔ شوق کا صِلہ دشت کی سلطنت غلَط　　چشمۂ خوں کا خُوں بہا جُوے رَواں نہیں نہیں

اعلان

ماہنامہ التخیل کا ''مطالعہ نمبر'' دوسری جلد کے پہلے تین ماہ (محرم، صفر اور ربیع الاول 1441ھ) کے شماروں پر مشتمل ہوگا، ان شاء اللہ۔ ماہنامہ التخیل کی پہلی جلد کے (پانچ) شماروں کو الگ کتابی شکل میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

یادگارِ زمانہ

علامہ عبدالعزیز میمن

ڈاکٹر خورشید رضوی

[مشہور ادیب پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی جو ماہنامہ التخیل کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور اردو ادب کا ایک معتبر نام ہیں۔ ان کا عربی و اردو کے شہرہ آفاق ادیب علامہ عبدالعزیز میمن صاحب کی شخصیت پر تحریر کردہ خاکہ، جس کا شمار اردو کے بہترین خاکوں میں ہوتا ہے، نذرِ قارئین ہے۔ ادارہ]

علامہ عبدالعزیز میمن کا نام پہلی مرتبہ میں نے اپنے استادِ گرامی ڈاکٹر صوفی محمد ضیاء الحق صاحب سے سنا۔ میں اس وقت غالباً ایف اے کا طالب علم تھا۔ ڈاکٹر صوفی صاحب علوم عربیت کے بحر زخار ہیں۔ ان کی زبان سے کسی کی ایسی توصیف بہت بڑے معنی رکھتی تھی۔ اسی زمانے میں میمن صاحب کو ڈاکٹر صوفی صاحب ہی کی وساطت سے پہلی مرتبہ دیکھنے کا شرف بھی نصیب ہوا۔ وہ یوں کہ صوفی صاحب نے ایک تحقیقی کام کے سلسلے میں کراچی کا سفر اختیار فرمایا اور از رہ محبت مجھے بھی اپنے چند ہم سفروں میں شامل کیا۔ کراچی میں ان کی منزل مقصود جو مقام تھا، اس کا نام شاید ''معارف اسلامیہ'' تھا یا اسی سے مشابہ کوئی نام۔

یاد آتا ہے کہ ایک روز میں بھی ڈاکٹر صوفی صاحب کے ہمراہ وہاں گیا اور وہیں پہلی مرتبہ میمن صاحب کی زیارت ہوئی۔ تاہم اس زیارت کو ملاقات کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ بس دونوں بزرگ بیٹھے کچھ مشورہ کر رہے تھے اور میں ذرا فاصلے سے انہیں دیکھ سکتا تھا۔ پھر بھی یہ دھندلا سا تصور میرے حافظے کے تصویر خانے میں موجود ضرور ہے۔ کتب خانے کی الماریوں کے سامنے میمن صاحب ادھر ادھر آ جا رہے ہیں۔ کوئی کتاب لیے ڈاکٹر صوفی صاحب سے کچھ گفتگو فرما رہے ہیں... پاؤں میں غالباً

فلیٹ بوٹ ہیں جو بعد کو بھی میں نے انہیں پہنے دیکھا۔

اب میرے ساتھ آٹھ نو سالوں پر سے جست لگاتے ہوئے آگے چلیے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایم اے کرنے کے بعد لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کیے ہوئے ڈھائی برس ہو چکے تھے۔ اکتوبر 1964ء میں علالت کے سبب مجھے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے مسلسل پانچ ماہ کی رخصت پر لاہور میں زیر علاج رہنا پڑا۔ کچھ عرصہ مکمل طور پر صاحبِ فراش رہنے کے بعد نومبر کے لگ بھگ میرے معالج نے مجھے صبح وشام ہلکی پھلکی سیر وتفریح کا مشورہ دیا۔ اورینٹل کالج میری مادر علمی تھی۔ میرے لیے اس کے در و بام میں بڑی کشش تھی، چنانچہ میں نے گاہ بگاہ وہاں جانا شروع کر دیا۔ ایک روز مینارڈ ہال" (اب شیرانی ہال) کے سامنے والے برآمدے میں استاد محترم جناب عبدالصمد صارم سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے اپنے مخصوص برجستہ انداز میں پوچھا "میمن صاحب سے مل لیے ہو؟'' میں نے عرض کیا ''نہیں''، فرمایا "مل لو، یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ" میمن صاحب ان دنوں پروفیسر حمید احمد خان صاحب مرحوم وائس چانسلر جامعہ پنجاب کی مساعی کے نتیجے میں شعبہ عربی اورینٹل کالج کے صدر تھے۔ صارم صاحب مجھے ان کے کمرے میں لے گئے اور میرے ننھیالی جد مولانا احمد حسن محدث امروہوی کے حوالے سے میرا تعارف کرایا۔ میمن صاحب نے مصافحہ فرمایا اور بتایا کہ وہ ایک زمانے میں امروہہ گئے تھے اور مولانا امروہوی سے ملے تھے۔ یوں پہلی مرتبہ میں نے عربی زبان وادب کے اس شہرہ آفاق عالم کو قریب سے دیکھا۔ رنگت گندمی، سینہ چوڑا، سفید ریش، قد درازی میں انگشت نما چہرہ جو پرانی تصویروں میں پرگوشت ہے، اب استخوانیت کی طرف مائل تھا۔ اونچی دیوار کی ٹوپی پہنے وہ مجھے مرزا غالب سے مشابہ نظر آئے۔

انہی دنوں ایک روز شام کو اپنے گھر کے قریب پونچھ روڈ پر ٹہل رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں مرزا غالب لمبا کوٹ اور فلیٹ بوٹ پہنے، چھڑی ہاتھ میں لیے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ پہلے میں ٹھنکا کہ غلط فہمی نہ ہو۔ مگر علیک سلیک کے بعد تصدیق ہوگئی۔ لاعلمی میں انہوں نے چھڑی میرے پاؤں پر رکھ دی اور خاصے وزن سے اس پر ٹیک بھی لگا دی اور گفتگو فرمانے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت مجھے حارث بن حلزم کا خیال آیا۔ جس کے بارے میں روایت ہے کہ دربار حیرہ میں معلقہ پیش کرتے

ہوئے وہ کمان کی ٹیک لیے تھا اور کمان کی نوک اس کی ہتھیلی کو چیرتی چلی جا رہی تھی مگر اسے کچھ خبر نہ تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں زد میں میرا پاؤں تھا اور انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ خیر اس سے قبل کہ تکلیف کا احساس پاس ادب پر حاوی ہو سکتا، انہوں نے پہلو بدلا اور میں رہا ہو گیا۔

خوش قسمتی یہ ہوئی کہ جامعہ پنجاب کی طرف سے میمن صاحب کو سمن آباد میں جو کوٹھی رہائش کے لیے لے کر دی گئی تھی، وہ میرے مکان سے کوئی ڈیڑھ ہی فرلانگ پر ہو گی۔ میمن صاحب کی طبیعت میں سادگی، بے تکلفی اور فاصلہ نہ رکھنے کا جو انداز تھا، اس نے جرت دلائی اور ان سے قریب قریب روز ہی ملاقات رہنے لگی۔ صورت یہ تھی کہ شام کا کھانا کھا کر میں ان کے ہاں جا پہنچتا۔ وہ بھی سیر کے لیے تیار ہوتے، مجھے ہمراہ لے کر سڑک پر نکل آتے۔ آدھ پون گھنٹہ چہل قدمی رہتی، جس کے دوران وہ اپنے مخصوص انسائیکلو پیڈیائی انداز میں مختلف ومتنوع موضوعات پر نہایت دلچسپ گفتگو فرماتے رہتے۔ کبھی استنبول اور مراکش کے کتب خانوں کی سیر دکھاتے، کبھی ڈاکٹر طہ حسین سے اپنی واحد مختصر ملاقات کا حال سناتے، کبھی ہندوستان کے بعض عربی کتبوں کا ذکر کرتے جنہیں بڑی عرق ریزی کے بعد انہوں نے پڑھ ڈالا تھا، کبھی ایک عرب شاعر احمد صانی دردی النجفی (غالبا یہی نام تھا) کا تذکرہ فرماتے جس نے رباعیات خیام کا عربی میں بہت عمدہ منظوم ترجمہ کیا اور کبھی علی گڑھ کی یادیں تازہ کرتے۔ ان کا اندازِ گفتگو، ان کی مجموعی شخصیت کی طرح برجستہ، بے تکلف اور تصنع سے پاک ہوتا تھا۔ جب کسی بات پر زور دینا ہوتا تو چلتے چلتے رک جاتے اور تھوڑی دیر کھڑے ہو کر گفتگو کرتے، کبھی عربی میں گفتگو شروع ہو جاتی، کبھی اردو میں ..... آواز کا اتار چڑھاؤ کسی رکھ رکھاؤ کے بغیر موضوع کے نشیب وفراز کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ دو تین ماہ پر پھیلی ہوئی ان صحبتوں کے نقوش آج تقریباً بیس برس کے بعد بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوئے اگرچہ اب ایک غبار سا ان کے اور میرے درمیان حائل ہونے لگا ہے۔ میں سمجھتا ہوں ابھی وقت ہے کہ اس امانت کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا جائے جس کا حافظہ اور عمر انسان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میری اور ان کی ان کی صحبتوں میں کوئی تیسرا شخص بالعموم حائل نہیں رہا۔ میرے تمام تر تاثرات ذاتی وشخصی نوعیت کے ہی ہیں۔ یہ وہ میمن صاحب ہیں جو خاص میرے مشاہدے میں آئے۔

میمن صاحب کی گفتگو آزاد تلازم خیال کے تحت ہوتی تھی لہذا نہ تو اسے کسی ترتیب میں لانا آسان ہے اور نہ تمام باتوں کا احاطہ کرنا۔ بس گھر سے نکلتے ہوئے کسی بھی موضوع کا ایک دھاگہ ان کے ہاتھ آجاتا تھا اور وہ راستے بھر اسے ادھیڑتے رہتے تھے اور واپسی پر دو چار رنگ برنگ گولے میری جیب میں ہوتے تھے۔ مثلاً ایک روز میں نے کسی کتاب کے بارے میں کہہ دیا کہ ''پڑھنے والی کتاب ہے'' اس پر ان کی طرف سے فوراً کچھ یوں جواب آیا۔ ''ارے، ارے، یہ کیا کہا آپ نے! ارے بھائی! آپ تو امروہے کے ہیں، کیا امروہے میں یہ اردو بولی جاتی تھی؟ بھائی ''پڑھنے والے'' تو آپ ہیں۔ کتاب پڑھنے ''والی'' کیسے ہوسکتی ہے؟ بھائی پڑھنے ''کی'' کتاب کہیے۔ ''پڑھنے کے لائق'' کتاب کہیے''.....وغیرہ وغیرہ

میمن صاحب خود راجکوٹ کے تھے۔ اردو ان کی زبان نہ تھی لیکن ڈپٹی نذیر احمد کے براہ راست شاگرد تھے اور اہل زبان میں ایک عمر بسر کی تھی۔ ہر چند کہ لہجہ دلی والوں کا نہ تھا مگر اردو سلیقے کی بولتے تھے۔ تاہم ''نوکرانی'' کو وہ ہمیشہ ''نوکریانی'' کہا کرتے تھے اور ''پت جھڑ'' کو ''پت جھاڑ''۔ یہ لفظ میں نے اس طرح سنا کہ ان دنوں ان کے ایک صاجزادے غالباً محمد عمر میمن، امریکہ گئے ہوئے تھے۔ ان کا خط آیا جس میں انہوں نے وہاں کے موسم کا نقشہ بڑے ادیبانہ انداز میں کھینچا تھا کہ پت جھڑ کا موسم ہے۔ ہوا چل رہی ہے اور درختوں کے پتے مسلسل گرتے ہوئے بڑے دل کش معلوم ہو رہے ہیں....وغیرہ وغیرہ۔

میمن صاحب نے یہ حصہ مجھے سنا کر تبصرہ فرمایا کہ دیکھیے یہ صاجزادے مجھے ''پت جھاڑ'' کی کہانیاں سنا رہے ہیں حالانکہ میں خود ''پت جھاڑ'' سے بھی آگے گزر چکا ہوں۔

ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے تلمذ پر میمن صاحب کو فخر تھا ''ڈپٹی صاحب'' کہہ کر انہیں یاد کرتے۔ ان کی عربیت کے بے حد معترف تھے۔ فرماتے تھے عربی میں صحیح معنوں میں میرے استاد وہی تھے۔ (شاگردوں میں ڈاکٹر سید محمد یوسف مرحوم کا ذکر خاص محبت سے کرتے تھے) ایک روز میں نے پوچھا کہ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی صاحب کی جو کہانی لکھی ہے کیا یہ ان کی صحیح تصویر ہے؟ فرمایا ''بالکل''۔ فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی صاحب کے ہاں جو جزرسی دکھائی ہے، اس کا اثر میمن صاحب کی

طبیعت میں بھی تھا۔ خیر بیگ صاحب کو تو یہ حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہو سکے مگر مجھے یاد آتا ہے کہ ایک روز سیر کو نکلتے ہوئے میمن صاحب نے ریاحی تکالیف کے لیے ادرک کا مربہ کھایا تو یہ کہہ کر کہ "لیجیے آج آپ کو ادرک کا مربہ کھلاتے ہیں،" مجھے بھی شریک فرمایا، یہ درست ہے کہ ستر برس کے پیٹے میں بھی وہ گھر سے یونیورسٹی بس میں آیا جایا کرتے تھے۔ (میں بھی ایک مرتبہ ان کے ہمراہ دو منزلہ بس میں سوار ہوا) شام کو بیکری سے انڈہ مکھن خریدنے بھی خود جاتے اور انڈوں کی چھوٹائی بڑائی پر بحث بھی کر سکتے تھے اور بھی ایسے پہلو، ان کے ہاں دیکھنے میں آئے کہ نظر بہ ظاہر انہیں بخل سے منسوب کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ دراصل اپنی اپنی ترجیحات کا ہے چنانچہ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اواخر عمر میں انہوں نے ایک لاکھ روپے کا عطیہ جامعہ پنجاب کو دیا کہ اسے فکس کرا دیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والے منافع سے مسلسل عربی کی کتب لائبریری کے لیے خریدی جاتی رہیں، خیر ذکر ڈپٹی صاحب کا تھا۔ ان کے بارے میں بتاتے تھے کہ خود حقہ پیا کرتے تھے مگر کسی اور کو اس حقے کی نے منہ میں لینے کی اجازت نہ تھی۔ آنے جانے والوں کے لیے میز پر چرٹ دھرے رہتے تھے کہ جسے طلب ہو ان سے شوق پورا کرے۔

ایک روز عربی زبان و ادب پر ڈپٹی صاحب کی غیر معمولی گرفت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے عزیزوں میں کا ایک لڑکا جو کالج میں پڑھتا تھا، ان کے پاس آیا اور کہا کہ ہمارے کالج میں امیر کابل (۱) تشریف لا رہے ہیں اور اس موقع پر اسے عربی کے کچھ شعر پڑھ کر سنانے کے لئے دس منٹ دیئے گئے ہیں۔ ابو العتاہیہ کا دیوان ان دنوں داخل نصاب تھا۔ لڑکے نے دو اشعار منتخب کیے جن کا مطلع ہے:

لا يذهبن بك الأمل.... حتى تقصر في العمل (۲)

لیکن عرض کیا کہ یہ اشعار تو چار پانچ منٹ میں تمام ہو جائیں گے۔ مدعا یہ تھا کہ اس زمین میں ڈپٹی صاحب خود کچھ کہہ دیں تا کہ وہ پورے دس منٹ اسٹیج پر رہنے کی خواہش پوری کر سکے۔ ڈپٹی

---

(۱) شاید امیر حبیب اللہ خان جن کی دلی میں آمد کا ذکر فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی میں کیا ہے۔

(۲) ابو العتاہیہ کے دیوان میں اس نظم کے اکیس اشعار موجود ہیں۔

صاحب کے کہے ہوئے نو شعر میمن صاحب کو یاد تھے۔ سیر کے دوران مجھے سنائے۔آج میمن صاحب سے سنی ہوئی تقریر سبھی باتیں محض حافظے سے نقل کر رہا ہوں لیکن ڈپٹی صاحب کے اشعار کو نایاب تصور کرتے ہوئے میں نے انہی دنوں نوٹ بھی کرلیا تھا۔ شعر یوں ہیں:

اللہ قدر في الازل ان لا نجاة بلا عمل   النصح ليس بنافع والسيف قد سبق العمل

والمرء ليس بخالد والعيش امر محتمل   كن حيث شيت من السهول وفي البروج وفی القلل

بدرکک موت في الزمان ولا يزيدک في الأجل   لذات دنيا كلها سم مشوب بالعسل

العمر فان فالنجا والموت آت فالعجل   حتام تقليد الهوى والام تجليد الحيل

المبتلی بعلائق الدنيا حمار في الوحل

شعر سنا کر میمن صاحب نے تبصرہ فرمایا کہ دیکھا؟ ڈپٹی صاحب کا کلام ابوالعتاہیہ کے اشعار سے ایسا یکجان ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہے۔

کبھی اپنے زمانہ، طالب علمی کے واقعات سنانے لگتے تھے۔ ایک روز بتایا کہ کچھ عرصہ میرا قیام مسجد نیلا گنبد لاہور کے ایک حجرے میں بھی رہا ہے۔ اسی دور کے کہے ہوئے اپنے ایک مدحیہ قصیدے کا ذکر بھی کیا۔ ایک شعر مجھے یوں یاد آتا ہے:

کان الفاضل القاضي تنبا   به اذ قال دام علا العماد

اب یاد نہیں آتا کہ ممدوح کون تھا۔ غالباً اس دور کی کوئی مقتدر شخصیت تھی۔ بہرحال اتنا تو شعر سے ظاہر ہے کہ نام "عماد" تھا۔ اس تلمیح کا پس منظر بھی میمن صاحب نے خود ہی بیان فرمایا کہ کاتب اصفہانی عماد الدین نے ایک روز القاضی الفاضل عبدالرحیم کو گھوڑے پر سوار دیکھا تو یہ عجیب وغریب جملہ بولا: "سر، فلا کبا بک الفرس" جاؤ سدھارو، خدا کرے تمہارا گھوڑا لغزش نہ کھائے۔" ندرت یہ تھی کہ اس پورے جملے کو اگر الٹ دیں تب بھی یہی جملہ باقی رہتا ہے۔ قاضی فاضل نے خداداد فراست سے فوراً اس نکتے کو بھانپا اور برجستہ جواب دیا: "دام علا العماد" "خدا کرے عماد کی بلندی ہمیشہ قائم رہے۔" اس میں ایک طرف عماد اصفہانی کے لقب کی رعایت ہے پھر عماد ستون کو کہتے ہیں چنانچہ اس کی بلندی کی دعا میں ایک معنوی رعایت ہے۔ علاوہ ازیں اس جملے کو بھی اگر الٹ دیں تو جوں کا توں

رہتا ہے۔

میمن صاحب غالب کے مداح تھے۔ایک مرتبہ غالب کے فارسی دیوان سے اپنی خصوصی دلچسپی کا ذکر فرمایا۔تاہم ان کے اپنے ذوق شعر پر مجھے شاعرانہ لطافت سے زیادہ عالمانہ مہارت کا غلبہ محسوس ہوا۔ان کا انتخاب شعر اکثر و بیشتر لفظی محاسن کے گرد گھومتا نظر آتا تھا۔عربی کے لاتعداد اشعار مع پس منظر ان کے حافظے میں ہمہ وقت موجود تھے۔جب کسی مناسبت سے کوئی شعر یاد آجاتا تو چلتے چلتے رک کر اکثر اس کی تمہید میں کوئی پر جوش جملہ بولتے مثلاً "لیجیے آج آپ کو دنیا کا بہترین شعر سنائیں" یا "ایسا شعر آپ کو کہیں نہ ملے گا" کوئی نہ سنائے گا وغیرہ۔ یہ ان کا مخصوص انداز تھا جس کا مقصد صرف اتنا ہی ہوتا تھا کہ شعر کے کسی خاص نکتے کی طرف توجہ منعطف کرائی جائے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے شاید دنیا کا بہترین شعر کہہ کر جو شعر سنایا اس میں چہرہ محبوب اور چہرہ مہتاب کی مماثلت کو ذرا سا بل دے کر پیش کیا گیا تھا:

بت اربها.... بدر الدجی؟(۱)........ حتی اذا غاب، ارتنیه

ایک مرتبہ ایک بڑی ہی برجستہ و بے ساختہ تضمین سنائی جس کا مزا آج تک لیتا ہوں۔فرمایا کہ اندلس کے شہر لوشہ میں ایک قاضی صاحب تھے جن کی بیوی بڑی ذہین و فطین تھی۔ایک مرتبہ وراثت کا پیچیدہ مسئلہ عدالت میں پیش ہوا۔قاضی صاحب گھر آئے تو سوچ بچار میں غرق تھے۔بیوی نے پوچھا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ تمہارے سمجھنے سمجھانے کا معاملہ نہیں.... تاہم بیوی نے اصرار کر کے پوچھ ہی لیا اور پھر ایک معقول حل بھی پیش کر دیا۔قاضی صاحب حیران ہوئے اور آئندہ کے لیے کرسی عدالت کی پشت پر ایک دریچہ رکھوایا جس میں ان کی بیگم بیٹھ جاتیں اور اکثر مسائل میں قاضی صاحب ان کے مشورے سے مستفید ہوتے رہتے۔ایک روز ایک شاعر کا مقدمہ ان کی عدالت میں پیش ہوا، اس نے جو یہ صورت حال دیکھی تو یہ شعر کہہ ڈالے۔

بلوشته قاض له زوجته   واحکامها في الوری جاریه
فیالیته لم یکن قاضیا   ویالیتها کانت القاضیه

---

(۱) یہ مصرع اچھی طرح یاد نہیں آتا۔

آخری مصرع میں آیت قرآنی کو جس بے ساختگی سے اقتباس کیا گیا ہے محض خدا کی دین ہے۔
ایک روز اندلس کے شہر مالقہ کے ایک شاعر کے یہ شعر سنائے:

مالقته حييت يا تينها الفلك من اجلك ياتينها

نهي طيبي عنك في علته بالطبيبي عن حياتى نهيا

ہر قافیے میں "یاتینھا" کے الفاظ نئی وضع اور نئے مفہوم میں آئے ہیں جو ایک یادگار اتفاق ہے۔
ایک روز یہ ذکر فرمایا کہ عربی میں "قال" صرف کہنے کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ اشارہ کرنے کا مفہوم بھی ادا کرتا ہے اور اس ضمن میں یہ نادر اور دلچسپ شعر سنائے

مررت بعطار يدق قرنفلا وسكا وكافورا فقلت له

فقال لي العطار رد قرنفلى وسكى و كافورى فقلت له

دونوں شعروں کے مصرع ثانی میں جہاں میں نے قطے لگا دیئے ہیں وزن شعر کے اعتبار سے وہاں کم از کم ایک سبب خفیف ورنہ ایک وتد مجموع بروزن "علن" کی کمی ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے بھی دونوں جگہ بات ادھوری ہے۔ یعنی میں ایک عطار کے پاس سے گزرا جو لونگ، مشک اور کافور کوٹ رہا تھا سو میں نے اس سے کہا۔ اس پر عطار نے مجھ سے کہا کہ میری لونگ مشک اور کافور واپس کر دو سو میں نے اس سے کہا....

دونوں جگہ معلوم نہیں کہ کیا کہا۔ مین صاحب نے وضاحت فرمائی کہ دونوں جگہ "قلت" سے مراد اشارہ کرنا ہے نہ کہ "کہنا"۔ انہوں نے اس اشارے کی عملی توضیح یوں فرمائی کہ پہلا شعر پڑھ کر آخر میں ناک کے راستے سانس زور سے اندر کو کھینچا اور سانس کے سر سے وزن شعر کو پورا کر دیا یعنی میں نے عطار کو لونگ مشک اور کافور کی خوشبو سونگھنے کا یوں اشارہ کیا۔ دوسرے شعر میں میمن صاحب نے اسی وزن پر سانس کو باہر نکالتے ہوئے وزن شعر کو ہموار کر دیا یعنی جب عطار نے واویلا مچایا کہ میری خوشبوئیں واپس کر دو تو میں نے کہا "یہ لو"۔

میمن صاحب کے بے ساختہ پن اور مخصوص طرز بیان میں بعض اوقات معمولی سی باتیں بھی بہت

مزا دیتی تھیں۔ میں اب تک سوچتا ہوں تو خیال ہی خیال میں لطف اٹھاتا رہتا ہوں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تحریر میں وہ فضا اور وہ انداز منتقل نہیں ہوسکتا۔ ایک روز شام کوان کے ہاں پہنچا تو سیر کے لیے نکلنے سے پہلے انہوں نے باہتمام ریڈیو کھولا اور بہت کان دھر کر سننے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ہم دونوں پر سکوت طاری رہا پھر میری طرف دیکھ کر برجستہ فرمایا، ذرا سی دیر میں آپ چرچل کے مرنے کی خبر سنیں گے۔ مجھے خبریں سننے اور اخبار پڑھنے سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ لہذا مجھے یکسر بے خبر پا کر انہوں نے مزید کہا: "آپ کو معلوم نہیں کئی روز سے بے ہوش پڑا ہے"۔ پھر انہوں نے خوب کان لگا کر اس خبر کا انتظار کیا مگر جہاں تک مجھے یاد ہے چرچل اس روز نہ مر سکا۔

میمن صاحب بسا اوقات شعر کو ایک مخصوص ترنم میں سنایا کرتے تھے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک روز ابن الرومی کا ذکر چھڑا اور انہوں نے بتایا کہ مرض الموت میں جب اسے یہ معلوم ہوا کہ طبیبوں کی رائے میں پیشاب رک جانے اور اس کے نتیجے میں موت واقع ہو جانے کا اندیشہ قوی ہے تو اس نے خود کہا۔ (یہ شعر سر راہ چلتے چلتے رک کر میمن صاحب نے اپنے مخصوص لحن میں پڑھا جس کا اتار چڑھاؤ اب تک کانوں میں گونج رہا ہے)۔

عنا ينقطع البول ويأتي الموت والهول

گفتگو کا رخ صرف ونحو اور زبان و بیان کی طرف مڑ جاتا تو بڑے پتے کی باتیں رواروی میں سنا ڈالتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ افعال ثلاثی مجرد کو ضبط کرنے کے لیے میں نے مکمل مختار الصحاح کو باقاعدہ خاطر نشیں کرنے کی کوشش کی ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مجھے بے سدھ ہو کر پڑ رہنے کی عادت ہے۔ قیلولے کی اس نیم خوابی کے وقفے میں حقے کے علاوہ "مختار الصحاح" پاس رکھ لیتا تھا۔ مدتوں اس کی ورق گردانی کرتے کرتے آخر افعال ثلاثی مجرد کے لغات کو بڑی حد تک تسخیر کر لیا۔

ایک روز سیر کے دوران "الجار قبل الدار" میں "الجار" کو زور دے کر بفتح الراء پڑھا اور پھر دہرایا کہ "الجارَ" نہ کہ "الجارُ" بضم الراء، سمجھانا یہ مطلوب تھا کہ "الجار" سے قبل کوئی فعل امر مقدر مانا جائے گا جس کا یہ مفعول ہوگا، لہذا حالت نصبی میں ہوگا۔

انہی دنوں "الروض الانف" مع متن سیرت ابن ہشام میرے زیر مطالعہ تھی۔ ایک جگہ ذکر آیا

کہ جس زمانے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام فرما تھے، ایک روز کھانے میں پیاز یا لہسن کی آمیزش ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کھانا ہاتھ ڈالے بغیر واپس کر دیا۔ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے دریافت کرنے پر آپ نے انہیں تو کھا لینے کی اجازت دی لیکن خود اپنے بارے میں فرمایا "انا رجل اناجی"۔ یہ لفظ "اناجی" میری سمجھ میں نہ آیا۔ اسی شام میمن صاحب کے پاس پہنچا تو ان سے ذکر کیا۔ کتاب اس وقت میرے پاس نہ تھی۔ زبانی ہی لفظ کے ہجے اور سیاق وسباق بیان کیا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا، "بھئی! یہ ہے "اُناجیٰ" بصیغہ مجہول بمعنی "مجھ سے سرگوشی کی جاتی ہے"۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ مطلب فی الفور آئینہ ہوگیا یعنی مجھ سے تو فرشتے ہم کلام ہوتے ہیں اور یہ بو، ان کو ناگوار گزرتی ہے۔ ایسے مواقع پر میمن صاحب خود اپنی ستائش میں بھی دو چار لفظ کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ یہ ان کا حق تھا۔ بقول غالب ؎

لائق مدح در زمان چو نیست خویشتن را ہی سپاس کنم

اس روز اسی کیفیت میں اپنے مخصوص اسلوب بیان میں کچھ یوں ارشاد ہوا۔ "آج آپ کو روئے زمین پر ایسا آدمی نہ ملے گا جو یوں عبارت دیکھے بغیر آپ کا یہ مسئلہ سلجھا دے"۔

"الروض الانف" کے نام سے یاد آگیا کہ وہ اس کتاب کے بڑے مداح تھے، ایک روز اپنے خاص ستائشی اسلوب میں فرمایا "بھئی سیرت کے باب میں یہ آسمانی کتاب ہے اور نحو کے باب میں سیبویہ کی کتاب آسمانی ہے"۔

زبان کے عوامی روزمرہ کے سلسلے میں ایک روز علمائے عربیت میں سے کسی کا لطیفہ سنایا۔ (نام مجھے یاد نہیں رہا) کہ صرف ونحو پر عالمانہ درس دینے کے بعد جب گھریلو بے تکلفی کی فضا میں بیٹھے تو ملازم کو آواز دے کر کچھ اس قسم کی بات کہی کہ فلاں سبزی مع جڑوں کے لاؤ۔ انہوں نے اس مطلب کے لیے جو لفظ استعمال کیے وہ عامی لہجے میں تھے۔ "بعروقو"۔ اس پر ایک شاگرد نے جو انہی کے علم وفضل سے اکتساب کر کے بیٹھا تھا، عرض کیا۔ "یا سیدی، هلا قلت: بعروقه" "استاد محترم! آپ اس کے بجائے "بعروقه" فرماتے تو مناسب تر ہوتا" اس پر بھڑک اٹھے اور چلا کر کہا: "یا غلام، ائتني

بعر و قو لا بعر و قه“ ”لڑکے! وہی عروقولاؤ، نہ کہ عروقہ“۔

ایک روز کچھ گفتگو معلقہ امرؤالقیس کے آخری اشعار خصوصا اس شعر کے حوالے سے ہوئی:

کان مکاکی الجواء غلیة صبحن سلافا من رحیق مفلفل

مگراب یہ یادنہیں آتا کہ موضوع گفتگو کیا تھا۔شاید اعراب کی کچھ بحث تھی یا شاید میں نے یہ شعر کی مناسبت سے پڑھا تھا۔ایک جملہ جو غالبا اسی گفتگو سے متعلق تھا، آج ایک خوشگوار یاد بن کر ذہن میں گونج رہا ہے۔میمن صاحب نے فرمایا تھا،”آپ کے غنیمت ہیں۔“ایک روز اور اسی طرح کی دلچسپ داد بھی یاد آرہی ہے۔سرِ راہ چلتے چلتے رک کر فرمانے لگے”بھئی آپ میں عربی ادب پڑھنے کی صلاحیت تو تھی لیکن (سر سے پاؤں تک میری جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) اس صحت کے ساتھ آپ کیا خاک عربی ادب پڑھیں گے۔ان کا اشارہ، ان دنوں میری مخدوش صحت اور عربی ادب کی صبر آزما وسعت کی طرف تھا۔غالبا اسی موقع پر اپنی نسبت یہ ارشاد فرمایا کہ میری صحت تو جوانی میں بڑی مضبوط تھی چنانچہ بڑی جانکاہ محنت کر سکا۔

عربی زبان وادب سے میرے گہرے شغف کی بناء پر وہ مجھ پر خصوصی شفقت فرمانے لگے تھے گاہے گاہے خود ٹہلتے ہوئے غریب خانے پر چلے آتے۔امالی ابن درید کی ایک مائیکروفلم ان کے پاس تھی۔میں نے دل چسپی کا اظہار کیا تو بے جھجک میرے حوالے کر دی۔حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کسی احتیاط کا مظاہرہ نہ کیا۔میں نے جوتوں کے ڈبے میں محدب عدسہ لگا کر پروجیکٹر بنانے کا جو طریقہ بچپن میں سیکھا تھا اس کو آزمایا اور ایک چھوٹا سا ریڈر بنا کر اس مائیکروفلم کو پڑھنے کی کوشش کی،میمن صاحب خود بھی تشریف لائے اور میری اس بچگانہ سی کوشش میں پوری دلچسپی لیتے ہوئے فرمایا بھئی معلوم ہو گیا کہ آپ اگر کوشش کریں تو ایک چھوٹا سا ریڈر کھڑا کر سکتے ہیں۔اس نام نہاد ریڈر یا پروجیکٹر کی تاریں کھلی یعنی شو کے بغیر تھیں۔ ہمارے گھر کا ملازم اکرم جو بڑا طرار لڑکا تھا دونوں تاریں ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا جب کہا جاتا تو وہ دونوں تاریں بجلی کے سوراخوں میں داخل کر کے پروجیکٹر کو روشن کر دیتا۔میمن صاحب اس کی چابکدستی اور بے خوفی سے بہت متاثر ہوئے اور کچھ یوں تبصرہ فرمایا”بھئی، یہ آپ کا ملازم تو تابط شرا ہے تابط شرا۔موت کو چکمہ دے کر نکلتا ہے“پھر تابط شرا

کے ان اشعار کا حوالہ دے کر وضاحت فرماتے رہے:

فخالط سهل الأرض لم يكدح الصفا به كدحة والموت خزيان بنظر

فأبت الى فهم ولم اك آئبا   وكم مثلها فارقتها وهي تصفر

اس روز پروجیکٹر سے جو عبارت دیوار پر روشن ہوئی اس میں ایک راوی کے نام کو میں نے "الثوری" پڑھا۔ میمن صاحب وسعت مطالعہ اور استحضار میں بلا کے آدی تھے، فوراً اصلاح فرمائی کہ یہ "الثوری" نہیں "التوزی" ہوگا۔ انہوں نے مطالعے پر کیسی جان کاہ محنت کی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ ایک روز از روئے شفقت انہوں نے میرے حافظے کی تعریف فرمائی تو میں نے عرض کیا کہ حافظہ تو دراصل آپ کا ہے کہ اس پیرانہ سالی میں آپ کو اس قدر ادبی سرمایہ نوک زبان ہے۔ فرمایا نہیں آپ ایک بار سن کر یاد رکھتے ہیں جب کہ میں نے یہ سب کچھ سو سو مرتبہ نظر سے گزارا ہے۔

مجھے ان کی شفقت کا ایک اور واقعہ بھی یاد رہے گا۔ ایک روز شام کو معمول کے مطابق پہنچا تو کوٹھی کے ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ کہنے لگے بھئی اچھا ہوا آپ آ گئے۔ آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔ ہمارے ہاں شعبہ عربی میں ایک لیکچرار کی اسامی خالی ہے۔ اس کے لئے کئی امیدوار ہیں۔ حمید احمد خاں صاحب وائس چانسلر مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ کیا کوئی مناسب آدمی مل گیا ہے میں نے کہا ایک آدمی نظر میں تو ہے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ امیدوار نہیں ہے۔ انہوں نے کہا آپ اس کی پروانہ کریں اگر وہ رضامند ہو تو کوئی نہ کوئی صورت نکالی جا سکتی ہے۔ تو بھئی میرا اشارہ آپ کی طرف تھا۔ اب آپ بتائیں کہ کیا آپ یونیورسٹی میں آنا پسند کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ سب سے پہلے تو آپ کے اس حسن ظن پر سراپا سپاس ہوں جو میرے لیے بہت بڑی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم دو ایک باتیں میرے لئے باعث تردد ہیں۔ ایک تو میں سرکاری ملازمت میں ہوں وہ چھوڑنی پڑے گی۔ فرمایا اس کی فکر نہ کریں جو کچھ فوائد اس کے اب تک ہوئے ہیں وہ آپ کی تنخواہ میں شامل ہو جائیں گے۔ میں نے عرض کیا دوسری بات ذرا نازک ہے۔ ہمارے ہاں یونیورسٹیوں کی فضا میں بالعموم سیاست کاری اور جوڑ توڑ کا غلبہ نظر آتا ہے اور میری طبیعت کو اس سے

مناسبت نہیں۔ یہ سنتے ہی لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور دوٹوک انداز میں فرمایا یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔ مجھ ستر برس کے بوڑھے کا گزارہ یہاں دشوار ہے۔ بھلا آپ کس کھیت کی مولی ہیں نا بھئی آپ وہیں ٹھیک ہیں"۔

ہمارا ملازم اکرم جس کا اوپر ذکر ہوا آزاد کشمیر کا تھا۔ نہایت ذہین اور بلا کا پھرتیلا۔ میمن صاحب اس کے بڑے مداح تھے۔ حالانکہ ہم اس کی ضرورت سے زیادہ پھرتی پر بسا اوقات تنگ آجاتے تھے۔ دوا کا وقت ہو جاتا تو وہ فورا جہاں میں بیٹھا ہوتا جاتا اور دوا کی گولی خود اپنے ہاتھ سے سیدھی میرے منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس پیش کرتا۔ ایک روز میمن صاحب غریب خانے پر تشریف فرما تھے کہ ان کی موجودگی میں اس نے میں حرکت کی۔

میں تو شاید کچھ خفیف ہی ہوا ہوں گا مگر وہ اس کے حق میں رطب اللسان تھے، "ارے بھئی! کیسا ملازم ہے آپ کے پاس، کس قدر راحت ہے آپ کو، ایک وہ ہمارا ملازم ہے، بدھو ہے نرا بدو۔" (ان کے ہاں بھی آزاد کشمیر ہی کا ایک لڑکا ملازم تھا) دیر تک وہ اپنے ستائشی کلمات دہراتے رہے۔

کبھی امور صحت پر گفتگو چھڑ جاتی تو بہت سی تجربے کی باتیں سناتے۔ سیر کے فوائد کے بڑے قائل تھے۔ ایک زمانے میں انہیں کچھ عوارض کے باعث سیر کی ازحد پابندی کرنا پڑی تھی۔ فرماتے تھے کہ میں فوجیوں کی طرح مارچ کرتا تھا حتی کہ کمر ٹوٹنے لگتی تھی مگر کمر پر پٹکا کس کے چلتا ہی چلا جاتا تھا۔ اب اگرچہ بوڑھا ہوں مگر آپ دیکھتے ہیں کہ شام کے کھانے کے بعد اپنے آپ کو اب بھی گھسیٹتا ہوں۔ ڈالڈا گھی کے سخت خلاف تھے۔ وہ اسے "ڈال" کے بجائے "دال" سے "دالدا" بولتے تھے اور اسے مہلک سمجھتے تھے۔ ان کا یہ جملہ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے "دالدا موت ہے موت"

ایک موقع پر یاد نہیں، مصر یا کسی اور ملک میں ایک چشمے کے صحت بخش پانی کا ذکر بڑی تعریف سے کیا۔ اپنے مخصوص انداز میں بے ساختہ فرمایا۔ کبھی اس چشمے کا پانی کیا پینا تھا میں تو تھوڑے ہی عرصے میں پھول کر ایسا ہو گیا جیسے بھینسا ہوتا ہے بھینسا۔

علی گڑھ کا ذکر چھڑ گیا تو معروف مستشرق پروفیسر کرنکو کے علمی استغراق کے واقعات سناتے اور تعریف کرتے رہے۔ فرماتے تھے کہ اس شخص کو اپنا اور اپنے گردوپیش کا کچھ ہوش نہ تھا۔ لیکن اگر یہ

پوچھا جائے کہ فلاں سفر میں جریر نے کس درخت کے نیچے پیشاب کیا تھا تو یہ اسے یاد ہوگا۔ کہنے لگے کہ ایک روز ڈنر تھا۔ موسم سخت سردی کا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر کرنکو دروازے سے داخل ہوئے اور حاضرین پر نظر دوڑائی۔ مجھے دیکھا تو سیدھے وہیں چلے آئے اور فی الفور عربی ادب پر گفتگو شروع کردی۔ کھانا ختم ہوگیا۔ لوگ اٹھ گئے مگر پروفیسر صاحب کو اپنی باتوں میں کچھ خبر نہ ہوئی۔ بالاخر میری تحریک پر اٹھے اور باہر آئے۔ یہاں سخت سردی کے باوجود کھلے آسمان تلے کھڑے ہوکر پھر گفتگو شروع کردی۔ اتنے میں ملازم اندر سے ایک اوورکوٹ لے کر آیا کہ یہ کسی کا پڑا رہ گیا ہے۔ پروفیسر کرنکو نے اس طرف مطلق توجہ نہ دی مگر میں سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ کوٹ انہی کا ہے۔ چنانچہ ان سے کہا کہ غور فرمایئے کہیں یہ کون آپ کا تو نہیں؟ اس پر ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی مگر پہچان نہ سکے پھر کچھ سوچ کر فرمایا۔ ہاں یہ میرا ہوسکتا ہے کیونکہ آج سردی خاصی ہے اور میری بیوی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ ممکن نہیں کہ اس موسم میں اس نے مجھے اوورکوٹ کے بغیر آنے دیا ہو۔ ای اثنا میں ملازم ایک فلٹ ہیٹ بھی اٹھا لایا۔ اسے بھی پروفیسر کرنکو نے اسی استدلال پر قبول کیا۔

میمن صاحب بتاتے تھے کہ کرنکو کی بیوی واقعی ان کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں میم اور صاحب دونوں غالباً شملے کی سیر کو چلے گئے۔ چھٹیاں ختم ہونے کو آئیں تو پروفیسر صاحب فوراً علی گڑھ واپس آنے اور درس وتدریس کا آغاز کرنے کے لئے بے تاب ہوگئے جب کہ بیگم گرمی کی شدت کے پیش نظر چندے اور قیام کرنا چاہتی تھیں پروفیسر صاحب نے کہا ٹھیک ہے میں چلتا ہوں تم کچھ دن بعد چلی آتا۔ بیگم نے کہا مجھے فکر ہے تم سفر میں اپنا سامان بھی سنبھال سکو گے یا نہیں۔ اس پر پروفیسر صاحب نے اسے اطمینان دلایا۔ مگر وہ انہیں خوب جانتی تھی۔ خود گاڑی میں سوار کرانے آئی۔ سیٹ ریزرو کرادی۔ کپڑے غسل خانے میں لٹکا دیئے اور بار بار کہا کہ دیکھو اس سلیپنگ سوٹ میں اتر کر نہ چلے جانا۔ جب علی گڑھ نزدیک آئے تو کپڑے بدل لینا۔ سامان بار بار دکھایا کہ یہ رکھا ہے بھول نہ جاتا۔ پروفیسر صاحب ہر بار اس کی تاکید کا جواب یہ کہہ کر دیتے رہے کہ ڈیر تم قطعاً فکر نہ کرو میں سب سنبھال لوں گا۔ الغرض وہ غریب رخصت ہوئی اور پروفیسر صاحب غالباً طلبہ سے اپنی ملاقات اور اپنے لیکچر کے موضوعات میں مستغرق جب علی گڑھ پہنچے تو اس شب خوابی کے لباس میں ملبوس،

بیک بینی و دو گوش سیدھے گھر تک چلتے چلے گئے۔ نوکر چاکر صاحب کی واپسی کے انتظار میں کوٹھی کے لان وغیرہ درست کر رہے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ بیگم ہمراہ نہیں اور صاحب سلیپنگ سوٹ پہنے چلے آ رہے ہیں تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ حواس باختگی سے واقف تھے لپک کر پوچھا صاحب، سامان کہاں ہے؟ فرمایا: ”ادھر، ٹرین میں“ انہوں نے عرض کیا ”صاحب ٹرین تو جا چکی ہوگی“ کہا ”تو کیا ان لوگوں نے سامان نہیں اتارا ہوگا؟“۔

ایک روز پروفیسر مارگولیتھ کی آمد کا حال بھی سنایا۔ ایک لطیفہ مجھے اب تک یاد آتا ہے۔ میمن صاحب نے مارگولیتھ کے عربی بولنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے کسی جملے کو سن کر مارگولیتھ نے ایک عجیب سی آواز نکالی پھر اس کی نقل میں خود آواز نکال کر دکھائی جو سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی اور ناقابل فہم۔ اس آواز کو تحریر میں لانا دشوار ہے۔ پھر فرمایا کہ آپ داد دیجئے کہ میں سمجھ گیا کہ یہ کہتا ہے ”مستحسن“ یعنی بہت خوب۔

میں صحت یاب ہو کر واپس سرگودھا آیا تو میمن صاحب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ میری نالائقی کہ مراسلت کا خیال نہ آیا ورنہ انہوں نے مجھے فراموش نہ کیا تھا۔ اس کا اندازہ یوں ہوا کہ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ریٹائرڈ پروفیسر حافظ احمد شفیع صاحب ایک زمانے میں میمن صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ لاہور میں ایک روز بس میں ان سے ملاقات ہوگئی تو سرگودھا کا نام سن کر اس عاجز کو بھی یاد فرمایا۔ صدر محمد ایوب خان صاحب نے ان کو Pride Of Performance کا اعزاز عطا کیا تو پاکستان ٹائمز میں ان کی تصویر دیکھی اور ایام گذشتہ کا خیال کرتا رہا۔ غالباً میمن صاحب اس وقت تک کراچی مراجعت فرما چکے تھے۔ خدا بھلا کرے پاکستان ٹی وی والوں کا، آخری مرتبہ ان کی وساطت سے میمن صاحب کی چلتی پھرتی تصویر جس میں ان کے شب و روز کے معمولات کا احاطہ کیا گیا تھا، دیکھی اور ان کی مانوس آواز میں ان کی کچھ آپ بیتی سنی، افسوس کہ یہ اس وقت سنی جب حقیقت میں وہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

1440ھ کے مسافرانِ آخرت

محمد بشارت نواز
معاون مدیر النخیل

اس دنیا سے ہر روز لاکھوں افراد آخرت کے سفر پر روانہ ہوجاتے ہیں، لیکن ایسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں جن کی جدائی پر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے دل میں ٹیس محسوس کرتی اور اشک بار ہو جاتی ہے۔ ان اشک بار ہونے والوں میں سے بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جنھوں نے مرحوم کی صورت کو بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ یہ محبت یقیناً اللہ تعالی کی طرف سے مقبولیت کی علامت ہے۔ برصغیر پاک و ہند سے اہل علم و معرفت کی ایسی ہی شخصیات بڑی تیزی کے ساتھ اٹھ رہی ہیں۔ گزشتہ برس یعنی 1439ھ میں حکیم الاسلام قاری محمد طیب قدس سرہ کے دو صاحب زادے مولانا محمد اسلم قاسمی متوفی 23 صفر المظفر 1439 مطابق 13 نومبر 2017ء، مولانا محمد سالم قاسمی متوفیٰ 26 رجب المرجب 1439 مطابق 14 اپریل 2018ء، سید عطاء اللہ شاہ بخاری قدس سرہ کے صاحب زادہ مولانا سید عطاء المؤمن شاہ بخاری متوفی 22 اپریل 2018، مفتی جمیل احمد تھانوی قدس سرہ کے صاحب زادہ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے نواسے مولانا مشرف علی تھانوی 30 اپریل 2018، شیخ المشائخ صوفی محمد سرور متوفی 29 شعبان 1439 مطابق 15 مئی 2018، مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودرویؒ متوفی 26 شوال 1439 مطابق 10 جولائی 2018 عازم سفرِ آخرت ہوئے۔

ذیل میں ایسی نابغہ روزگار شخصیات کا مختصر تعارف ذکر کیا جارہا ہے جو سن 1440 ھجری میں اس دنیا فانی سے کوچ کر گئیں:

حضرت مولانا عبدالرشید بستوی رحمہ اللہ: آپ 2 جنوری 1966ء کو ضلع بستی یوپی کے کھمریا

گاؤں میں جناب گل محمد کے صاحب کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی ایک دفعہ گنگوہ مزار پر حاضر ہوئے تو اللہ تعالی سے دعا مانگی کہ میرے ہاں لڑکا ہوا تو مولانا گنگوہی کے نام پر ہی نام رکھوں گا اور عالم بناؤں گا چناچہ آپکی پیدائش ہوئی تو رشید احمد نام ہی تجویز ہوا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب سے حاصل کی، متوسطات کیلئے مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوئے اور 1983ء میں دارالعلوم دیوبند میں سالِ ششم میں داخل ہوئے اور 1986ء میں دارالعلوم دیوبند سے ہی سندِ فراغت حاصل کی۔ دارالعلوم اسلامیہ بستی دارالعلوم دیوبند اور جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند میں تدریسی خدمات سر انجام دیں۔ عربی و اردو کے تیس سے زائد مئولفات و مصنفات اور تراجم بطورِ یادگار چھوڑیں۔ 15 صفر المظفر 1440ھ مطابق 25 اکتوبر 2018ء عازمِ سفرِ آخرت ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

مولانا سمیع الحق شہید رحمہ اللہ: دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے بانی حضرت مولانا عبدالحق قدس سرہ کے فرزند ارجمند، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مہتمم و استاذِ حدیث، جمیعت علماء اسلام (س) کے امیر حضرت مولانا سمیع الحق رحمہ اللہ 12 رجب المرجب 1355ھ مطابق 3 ستمبر 1936ء کو اکوڑہ خٹک کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے، درسِ نظامی کی مکمل تعلیم دارالعلوم حقانیہ ہی میں رہ کر حاصل کی، 1958ء میں دورہ حدیث کیا۔ 22 سال کی عمر میں دارالعلوم حقانیہ میں تدریس شروع فرما دی گویا آپ کی تدریسی خدمات ساٹھ سال پر محیط ہیں۔ ماہنامہ الحق کا اجراء آپ کا بڑا کارنامہ ہے جو 54 سال سے اپنی روشنیاں بکھیر رہا ہے۔ اس کے علاوہ آپ بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ 23 صفر المظفر 1440ھ مطابق 2 نومبر 2019ء کو نمازِ عصر کے بعد ان کے گھر بحریہ ٹاؤن اسکیم راولپنڈی میں بے دردی سے ذبح اور شہید کر دیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

ملک و بیرون ملک کے اخبارات و مجلّات نے آپ کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور آپ کی شہادت کو عظیم سانحہ قرار دیا۔ حضرت کی سوانح مولانا عبدالقیوم حقانی نے دو جلدوں پر مشتمل "مولانا سمیع الحق شہید حیات و خدمات" کے نام سے تالیف فرما دی ہے، اس کے علاوہ ماہنامہ الحق خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی شہادت پر خصوصی نمبر نکالنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔

داعی کبیر حاجی عبدالوہاب صاحب رحمہ اللہ: آپ 1922ء میں کرنال میں پیدا ہوئے،

ابتدائی تعلیم کرنال ہی میں حاصل کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور سے گریجویشن کی اور انگریز دورِ حکومت میں تحصیل دار بھرتی ہوئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد تبلیغ دین کی محنت میں جڑ کر نوکری چھوڑی اور اس عظیم محنت کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ آپ کو تبلیغی جماعت کے بانی حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ کے صحبت یافتہ ہونے کا شرف حاصل تھا، اس کے علاوہ آپ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری اور حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس اللہ سرہما کے خلیفہ اور مسترشد، حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی و حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی مولوی نور اللہ مرقدہ کے رفیق اور معتمد خاص تھے۔ 1992ء میں تبلیغی جماعت کے پاکستان کے امیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے 75 سال اللہ کے دین کی تبلیغ کے لیے صرف کیے۔ گزشتہ کئی سالوں سے علیل تھے اور گاہے بگاہے ان کے مختلف آپریشنز ہوتے رہتے تھے، آخر کار 9 ربیع الاول 1440ھ مطابق 18 نومبر 2018ء کو لاکھوں تبلیغی رفقاء کے مصلح، ہزاروں غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کرنے والے، پوری دنیا انسانیت کے لئے درد دل رکھنے اور تڑپنے والے، داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے دارالبقاء کی طرف روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ملک و بیرون ملک سے لوگوں نے آپ کے جنازے میں شرکت کی۔ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے والوں لوگوں کی تعداد لاکھوں میں بتائی جاتی ہے۔ مفتی محمد وقاص رفیع صاحب نے آپ کے تفصیلی حالات پر مشتمل "سوانح حاجی عبدالوہاب صاحب" مرتب فرمادی ہے۔

حضرت مولانا محمد جمیل صاحب رحمہ اللہ: آپ کی پیدائش 1946ء میں خان پور کے قریب چک 66 سہجہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جامعہ مخزن العلوم خان پور میں حاصل کی، اس کے بعد آپ جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں داخل ہوئے۔ دورہ حدیث جامعہ مخزن العلوم خانپور میں کیا۔ حضرت مولانا شفیق الرحمن درخواستی سے بخاری شریف کی جلد اول جبکہ دوسری جلد حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبداللہ درخواستی صاحب سے پڑھی۔ فراغت کے بعد خانپور میں واقع ''بلال مسجد'' میں تدریسی خدمات شروع کیں، کچھ ہی عرصہ بعد رائے ونڈ مرکز تشریف لائے اور مدرس مقرر ہوئے، 1994ء سے وفات سے کچھ عرصہ قبل تک رائیونڈ مرکز کے امام رہے۔ 1999ء میں مدرسہ عربیہ تبلیغی مرکز

رائیونڈ میں دورہ حدیث کی ابتداء ہوئی تو آپ کو مؤطا امام مالک اور مؤطا امام محمد کے اسباق ملے۔ کچھ عرصہ علیل رہے اور 17 ربیع الاول 1440ھ مطابق 26 نومبر 2018 کو راہی آخرت ہوئے۔

حضرت مولانا محمد اسرار الحق قاسمی رحمہ اللہ: آپ 15 فروری 1942ء کو بھارت کے صوبہ بہار کے علاقے کشن گنج میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہی حاصل کی، 1964ء میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت پائی۔ سن 2009ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی ٹکٹ پر کشن گنج کی نشست سے عام انتخابات میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ 2014ء کے عام انتخابات میں انہوں نے بی جے پی کے امیدوار دلیپ جیسوال کے خلاف مقابلہ کیا اور اپنی نشست برقرار رکھی اور پورے صوبہ میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سرگرم رکن رہے، جمعیت علمائے ہند کے دیرینہ کارکن اور اس کے سکریٹری بھی رہے، نیز آپ آل انڈیا ملی کاونسل کے نائب صدر بھی تھے۔ 28 ربیع الاول 1440ھ مطابق 6 دسمبر 2018ء کی رات "سیرت" کے ایک جلسہ میں تقریر کی۔ کچھ ہی گھنٹوں بعد صبح 3 بجے کے قریب دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا اور 7 دسمبر 2018ء کو 76 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

مولانا رشید اشرف سیفی صاحب رحمہ اللہ: مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع قدس سرہ کے نواسے مولانا رشید اشرف صاحب 1957ء میں پیدا ہوئے، انیس سال کی عمر میں انہوں نے سند فراغت حاصل کی، 1976ء میں ان کا دارالعلوم کراچی میں بطور استاد تقرر ہوا، یہ آخری استاد تھے جن کا تقرر مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے کیا، اس طرح تقریبا 45 سال انہوں نے دارالعلوم کراچی میں تدریسی، تصنیفی اور انتظامی خدمات انجام دیں۔ دو سال قبل ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس کی وجہ سے ان کی آواز اور زبان میں اثر تھا لیکن روبہ صحت تھے۔ وصال سے چند روز قبل عمرے کے لیے گئے، واپسی ہوئی۔ 25 دسمبر 2018ء کو دوبارہ فالج کا حملہ ہوا، دماغ کی رگ پھٹی، بے ہوش ہوئے، کچھ دن بے ہوش رہے آخر کار 24 ربیع الثانی 1440ھ مطابق 31 دسمبر 2018 کو داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اگلے دن مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ کی امامت میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کی سنن ترمذی شریف کے درسی افادات پر مشتمل، مقبول عام کتاب ’’درس ترمذی‘‘ مولانا رشید اشرف صاحب کی ہی مرتب کردہ ہے۔ دورہ حدیث میں گذشتہ بارہ تیرہ سال سے سنن ترمذی کا سبق ان کے پاس تھا اور مدرسہ البنات کا نظم بھی آپ کے ذمے تھا۔ اردو ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اپنے اساتذہ میں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب سے بہت متاثر تھے۔ حضرت کی نسبی اولاد میں تین فرزند اور چار بیٹیاں ہیں۔

مولانا حمد اللہ جان صاحب عرف ڈاگئی بابا جی: آپ 1914ء کو پیدا ہوئے، انہوں نے اپنے والد علامہ عبد الحکیم اور اپنے چچا مولانا صدیق صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، یہ دونوں بزرگ حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے ہم درس تھے۔ فنون کی کتابیں انہوں نے مولانا حبیب اللہ سے پڑھیں، مولانا حبیب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے سابق شیخ الحدیث وصدر مفتی، مفتی فرید صاحب کے والد ماجد تھے، بابا جی نے دار العلوم دیوبند میں کچھ عرصہ پڑھا لیکن طالب علمی کے آخری تین سال مظاہر علوم سہارن پور میں گزارے اور سن ہجری 1366ھ مطابق 1947ء میں وہیں سے انہوں نے دورہ حدیث کیا، صحیح بخاری شریف جلد اول، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ، جلد ثانی، حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب، ترمذی شریف ولی کامل مولانا عبد الرحمن کامل پوری اور سنن نسائی مولانا اسعد اللہ صاحب سے پڑھی۔ آپ نے پون صدی تک اپنے علاقہ ’’ڈاگئی‘‘ مردان میں اسلامی علوم کی تدریسی اور تصنیفی خدمات انجام دیں۔ افغانستان میں 1997ء میں امارت اسلامیہ قائم ہوئی تو اسلامی ریاست کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے اور چند سال امارت اسلامیہ کے دار العلوم فاروقیہ میں شیخ الحدیث اور شیخ التفسیر کے منصب پر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں ہزاروں علماء نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ 6 جمادی الاولیٰ 1440ھ مطابق 12 جنوری 2019ء کو انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید ندوی صاحب رحمہ اللہ: آپ کی ولادت لکھنؤ کے قریب واقع تکیہ کلاں ضلع رائے بریلی میں 1933ء میں ہوئی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں بی اے اور پھر وہیں سے ایم اے بھی کیا۔ آپ مفکر اسلام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے بھانجے اور ندوہ العلماء کے سربراہ حضرت مولانا محمد رابع ندوی صاحب کے بھائی تھے۔ دارالعلوم ندوہ العلماء کے ناظم تعلیم بھی رہے۔ اس کے علاوہ مدرسہ فلاح المسلمین، رائے بریلی کے ناظم اور دارعرفات کے نائب صدر تھے۔ نیز دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عربی ماہنامہ البعث الاسلامی کے تاحیات مدیر رہے۔ 9 جمادی الاول 1440ھ مطابق 16 جنوری 2019ء بروز بدھ کو مسافرانِ آخرت میں شامل ہوئے۔ ماہنامہ پیامِ عرفات رائے بریلی اور ماہنامہ ارمغان پھلت نے ان کی یاد میں خصوصی نمبر شائع کیے۔

حضرت مولانا محمد احمد بہاول پوری صاحب رحمہ اللہ: آپؒ 1926ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا حضرت مولانا صدیق احمدؒ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے سگے چچازاد بھائی اور شاگرد تھے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت کی اور مجاز ہوئے۔ مولانا احمد صاحب کے والدِ گرامی حضرت مولانا فاروق احمد صاحب حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے اور جامعہ اسلامیہ عباسیہ بہاول پور کے شیخ الحدیث رہے۔ ابتدائی تعلیم جامعہ اسلامیہ عباسیہ سے حاصل کیں اور 1941ء میں دورہ حدیث کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ صحاح ستہ کی کتابیں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ سے پڑھیں، حضرت مدنیؒ سے اسباق چند ہی دن پڑھے تھے کہ تحریک آزادی کے سلسلہ میں مولانا مدنیؒ نینی تال جیل میں نظر بند ہو گئے۔ آپ دارالعلوم دیوبند سے 1942ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ عالی سند کی حامل شخصیت تھے۔ حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحبؒ آپ کے دورہ حدیث کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ 1945ء تا 1982ء جامعہ اسلامیہ عباسیہ بہاول پور میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔

مولانا احمد صاحب کا شمار تبلیغی جماعت کی مرکزی قیادت میں ہوتا تھا۔ آپ تبلیغی مرکز رائے ونڈ کی شوریٰ کے رکن بھی تھے۔ رائے ونڈ سالانہ تبلیغی اجتماع پر آپ کا بڑی اہمیت کے ساتھ بیان ہوتا تھا۔ آپ اپنے تبلیغی بیانات میں موجودہ نوجوان جہادی لوگوں پر بے دریغ شدید نقد فرماتے تھے۔ آپ سے ایک مجلس میں پوچھا گیا کہ آپ بہت سختی فرماتے ہیں، موجودہ جہادی قیادت کو آپ کے بیانات پر شدید تحفظات ہیں۔ (یہ زمانہ روس کے مقابلے میں افغانستان سے معرکہ کا تھا۔) پرنم آنکھوں سے

فرمایا: ''امریکہ کو جہاد سے کیا تعلق، جہاد اسلام کا مقدس فریضہ ہے۔ امریکہ کی اس معاملہ میں امداد و معاونت، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امریکہ جہاد نہیں، روس کے مقابلہ میں اسلام کے مقدس فریضہ کے نام کو غلط استعمال کر رہا ہے۔ یاد رکھنا! جب امریکہ روس سے فارغ ہوا تو اس نے پھر ان جہادیوں کو نشانہ پر رکھنا ہے۔'' (ماہنامہ لولاک مارچ 2019ء)

مولانا محمد احمد صاحبؒ نے اپنا اوڑھنا بچھونا، حیات و ممات، صحت و مرض اور سفر و حضر غرض زندگی کے ہر شعبہ کو تبلیغی کام پر نثار کر دیا تھا، وہ حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے زمانہ سے پورے عالم میں تبلیغی فکر کے لیے پا بہ رکاب تھے۔ 19 جمادی الاولیٰ 1440ھ مطابق 26 جنوری 2019ء صبح ساڑھے تین بجے وصال فرما گئے۔ دارالعلوم مدنیہ کے شیخ الحدیث عالم ربانی حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمن صاحب میں آپ کا جنازہ پڑھایا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈوی رحمہ اللہ: آپ ضلع سہارنپور کے شمال مغرب میں واقع قصبہ سکروڈھہ میں 1946ء میں پیدا ہوئے۔ تحصیلِ علم کے لیے دارالعلوم دیوبند میں تشریف داخل ہوئے، 1970ء میں دارالعلوم دیوبند میں تحصیلِ علم سے فراغت پائی۔ فراغت کے بعد قاسم العلوم کا گل ہیڑی میں تدریسی خدمات شروع کیں۔ کچھ عرصہ بعد دارالعلوم تشریف لے گئے اور دارالعلوم میں تدریس کا آغاز فرمایا۔ دارالعلوم وقف دیوبند کے قائم ہونے کے بعد وہاں تشریف لے گئے، سن 2000ء میں دارالعلوم وقف سے چھٹی لے کر مرکزی دارالعلوم دیوبند تشریف لے آئے۔ درسِ نظامی کے نصاب میں شامل کئی کتابوں کی آسان، عام فہم، اردو شروحات تحریر فرمائیں جن سے برصغیر کے اکثر علماء وطلباء بخوبی واقف ہیں اور تقریباً ہر ایسے مدرسے کی لائبریری میں یہ ضرور موجود ہوں گی جس میں درس نظامی کا سلسلہ ہے۔ مکتبہ الحجاز کے نام سے کتب خانہ قائم کیا۔ سولہ مہینے کینسر کے مہلک مرض میں مبتلا رہنے کے بعد 23 رجب المرجب 1440ھ مطابق 31 مارچ 2019ء کو شام چار بجکر پچاس منٹ پر انتقال ہو گیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ حضرت کی یاد میں مفتی محمد ساجد کھجناوری صاحب کی خصوصی کاوش کے ساتھ ''سہ ماہی متاع کارواں'' کا ذکرِ جمیل نمبر شائع کیا گیا۔

حضرت مولانا مفتی افتخار الحسن کاندھلوی رحمہ اللہ: مشہور مفسر قرآن، شیخ طریقت حضرت

مولانا افتخار الحسن کاندھلوی 10 جمادی الاولیٰ 1340ھ مطابق 10 جنوری 1922ء کو کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔ 1948ء میں مظاہر علوم سہارنپور میں تحصیلِ علم سے فراغت پائی۔ 1947ء میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی طرف سے اجازت وخلافت سے نوازا گیا، حضرت رائے پوری نے آپ کو ''صوفی جی'' کا لقب دیا تھا۔ آپ اپنے وقت کے عظیم مفسرِ قرآن تھے۔ باون سال تک کاندھلہ میں تفسیرِ قرآن کا درس دیتے رہے، جس میں پانچ دور مکمل کیے، اس کا آخری ختم 1993ء میں ہوا۔ حضرت علی میاں ندوی رحمہ اللہ نے بھی اس میں شرکت فرمائی۔ آپ بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہما اللہ کے برادر نسبتی جبکہ پیر جی حضرت مولانا محمد طلحہ کاندھلوی کے سسر تھے۔ آپ ایک طویل عرصے سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو اور مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ کچھ عرصہ سے صاحبِ فراش تھے، 27 رمضان المبارک 1440ھ مطابق 2 جون 2019ء کو شام پانچ کر چالیس منٹ پر زمزم کے چند قطرے منہ میں ڈالے گئے، اسی دوران آپ کا وصال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگلے روز مولانا محمد سعد کاندھلوی صاحب کی امامت میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ پسماندگان میں سات اولاد ہیں جن میں حضرت کے جانشین، عظیم مؤرخ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی بھی ہیں۔

حضرت مولانا نورالہدیٰ صاحب رحمہ اللہ: آپ جامعہ اشرفیہ لاہور کے قدیم فضلاء میں سے تھے، 1965ء میں انہوں نے وہاں سے دستار فضیلت حاصل کی تھی اور شیخ الکل حضرت مولانا رسول خان صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ سے انہیں شرف تلمذ حاصل تھا۔ 1969ء میں جامعہ ربانیہ کے نام سے ناظم آباد اور 1981ء میں قصبہ کالونی کراچی میں دینی درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ آپ ایک پختہ ذی استعداد عالم دین اور ممتاز مدرس تھے، ایک زمانہ میں کراچی کی سیاسی بساط پر بڑے فعال تھے، بیس سال تک جمعیت علمائے اسلام کے کراچی کے امیر بھی رہے، انہوں نے قومی اسمبلی کے لیے کراچی سے انتخابات میں بھی حصہ لیا لیکن درس وتدریس کے شعبے سے آخر تک وابستہ رہے اور کئی عشروں سے صحیح بخاری شریف کا درس دیتے رہے۔ پندرہ کے قریب اردو اور عربی کی کتابوں کے مصنف تھے۔ 6 شوال المکرم 1440ھ مطابق 10 جون

2019ء کو تہجد کے وقت دارِ عقبیٰ کے راہی ہوئے۔ اسی دن شام چار بجے نمازِ جنازہ، ان کے بیٹے مولانا شمس الہدیٰ کی امامت میں ادا کی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ لواحقین میں دو بیواؤں، نو بیٹوں اور نو بیٹیوں سمیت ہزاروں شاگردوں کو سوگوار چھوڑا۔

حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ: آپ یکم جنوری 1950ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے 1974ء میں ایم بی بی سی کا کورس مکمل کیا، اس کے بعد 1983ء میں جامعہ مدینہ لاہور سے وفاق المدارس کا امتحان پاس کیا۔ 1983ء سے 2002ء تک جامعہ مدنیہ جبکہ 2003ء سے 2019 تک جامعہ دارالتقویٰ لاہور میں افتاء و تخصص کی تدریس کی خدمات سرانجام دیں۔ 1979ء سے 2010ء تک میڈیکل آفیسر کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف تھے، جن کی تفصیل ماہنامہ النخیل ذیقعدہ 1440 میں ذکر کی گئی۔ 18 شوال المکرم 1440ء مطابق 22 جون 2019ء کو انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

پیر جی حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ: حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کے اکلوتے فرزند (پیر جی) حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ، جن کا طویل علالت کے بعد 10 ذی الحجہ 1440 کو میرٹھ کے آنند ہسپتال میں وصال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کے تعارف پر مشتمل مضمون اس شمارے میں شامل ہے۔

شیخ محمد مختار سلامی رحمہ اللہ: تیونس کے سابق مفتی اعظم اور نامور عالم دین شیخ محمد مختار سلامی 1925ء کو پیدا ہوئے۔ آپ فقہ مالکی پر عبور رکھنے کے ساتھ جدید مسائل کے حل کا بھی خاص ذوق اور سلیقہ رکھتے تھے، مقالات لکھتے اور بحث و مناقشہ میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ عرصہ تک تدریس کے مشغلہ میں رہنے کے بعد انہیں 1984ء میں شیخ محمد الحبیب بلخوجہ کی جگہ پر تیونس کا مفتی عام منتخب کیا گیا تھا چنانچہ وہ 1998ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ انہوں نے قیاس، مقاصد شریعت، اجتہاد وتجدید اور اسلام کے سیاسی نظام جیسے موضوعات پر اپنی گرانقدر تصنیفات بھی یادگار چھوڑی ہیں۔ 17 ذی الحجہ 1440ھ مطابق 19 اگست 2019ء کو انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مسافرانِ آخرت

اور ذکر کی مجلس سونی ہوگئی

مفتی محمد عفان منصور پوری

صدر المدرسین جامع مسجد امروہہ

[شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کے اکلوتے فرزند (پیر جی) حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ ۲؍جمادی الاولی ۱۳۶۰ھ مطابق ۲۸؍مئی ۱۹۴۱ء یوم دوشنبہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مظاہر علوم سہارنپور میں حاصل کی جبکہ فراغت مدرسہ کاشف العلوم مرکز نظام الدین دہلی سے ہوئی۔ اُنہوں نے کتابوں کی تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے قائم کردہ کتب خانہ یحیوی کو ترقی دی اور اپنے والد کی بہت سی نایاب ہوچکی کتابوں کو اہتمام کے ساتھ شائع کرایا۔ حضرت کے مختصر تعارف پر مشتمل مفتی محمد عفان منصور پوری صاحب (نواسہ حضرت شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ) کا تحریر کردہ مضمون نذرِ قارئین ہے۔ ادارہ]

معرفت وسلوک کے امام، رہبر شریعت وطریقت، سادگی وزہد کے مرقّع، یادگار اکابر، سرپرست مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور، رکن مجلس شوری دارالعلوم دیوبند، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ کے خلیفہ وجانشین (پیر جی) حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی علیہ الرحمہ ۱۰ / ذی الحجہ ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۲ / اگست ۲۰۱۹ء بہ روز پیر عیدالاضحیٰ کے دن دوپہر پونے تین بجے میرٹھ کے آنند اسپتال میں تقریباً اسی برس کی زاہدانہ زندگی گزار کر واصل بحق ہوگئے۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

اسی دن شب میں ٹھیک گیارہ بجے قبرستان حاجی شاہ کمال سہارنپور کے وسیع میدان میں قائد ملت

اسلامیہ حضرت مولانا سید ارشد صاحب مدنی دامت برکاتہم صدر جمعیت علماء ہند کی اقتداء میں ہزار ہا ہزار افراد نے جنازہ کی نماز ادا کی اور پھر وہیں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

حضرت مولانا کا سانحہ ارتحال اس دور قحط الرجال میں عوام وخواص سب کے لیے بڑا خسارہ ہے۔ آپ نے اس مادی دور میں دنیا سے بے رغبتی اور رجوع الی اللہ کی جو نظیر پیش کی ہے وہ بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے، ہر دم فکر آخرت میں مستغرق رہ کر ذکر الٰہی سے زبان کو سرشار رکھنا آپ کا محبوب وطیرہ تھا، بلا شبہ آپ کی رحلت مجالس ذکر کو سونا کر گئی۔

آپ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے والد بزرگوار کے حلقہ ارادت کو نہ صرف سنبھالا بل کہ وسعت دی اور ان کی دینی رہنمائی وتربیت کا عظیم فریضہ انجام دیا۔ آپ خود بھی متبع سنت تھے اور دوسروں کو بھی سنت ہی پر عامل دیکھنا پسند کرتے تھے، خلاف سنت وضع قطع اختیار کرنے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے تھے، کسی ایسے شخص کا مجلس میں آجانا جس کے سر پر انگریزی بال ہوں اور چہرہ ڈاڑھی سے خالی ہو آپ کو برہم کرنے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ بھری مجلس میں اس پر سختی کے ساتھ نکیر فرماتے ،بعض لوگوں کو آپ کا یہ عمل ناگوار بھی گزرتا لیکن بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں یہ بروقت تنبیہ دینی انقلاب کا باعث بن جاتی۔

خانوادہ مدنی سے آپ کو بڑی قربت تھی اس لئے کہ آپ نے اپنے والد محترم اور شیخ الاسلام حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ اوران کے اہل خانہ کے ساتھ دیرینہ مراسم اور گھر جیسے تعلقات کو خود دیکھا تھا۔

کچے گھر میں بچپن ہی سے ہمیں جانا یاد ہے ابتداء میں کبھی حضرت والد محترم مدظلہ العالی کے ہمراہ تو کبھی برادر بزرگوار دام اقبالہ کے ساتھ جب بھی حاضری ہوئی غیر معمولی تعلق کا آپ نے مظاہرہ فرمایا، پہلے سے آنے کی اطلاع ہوجاتی تو فون کر کے معلوم کرتے رہتے کہ کہاں پہونچے ہو، ہر مرتبہ پر تکلف ناشتہ کا اہتمام فرماتے، کھانے کا وقت ہوتا تو مجال ہے کہ بغیر کھانا کھائے چلے آئیں، اگر کسی اور کے یہاں کھانے کا وعدہ کر لیتے تو ناراضگی کا اظہار فرماتے اور ارشاد فرماتے کہ تمہارے نانا سہارنپور میں کچے گھر کے علاوہ کہیں مہمان نہیں بنتے تھے، اس لیے جب بھی آؤ اپنے گھر کی طرح کھانا یہیں کھاؤ،

واپسی کے وقت اکثر وبیشتر کتب خانہ یحیوی کی مطبوعہ کتب، نقدی، عطر یا کوئی اور چیز بڑی محبت کے ساتھ بہ طور ہدیہ عنایت فرماتے اور دعاؤں سے نوازتے۔

گذشتہ سالوں میں کتب خانہ کے قیام اور بکری پالنے کی بڑی ترغیب دیتے تھے، اس کے طریقہ کار کو سمجھاتے اور فوائد کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتے، متعدد مرتبہ باقاعدہ فون کر کے اس سلسلہ میں پیش قدمی کرنے کی ہدایت بھی دی اپنے ممکنہ تعاون کا بھر پور یقین دلایا لیکن ہماری طرف سے سستی رہی اور ان دونوں کاموں میں سے کچھ بھی نہ ہوسکا۔

خاکسار کی مجلس نکاح میں خسر محترم حضرت مولانا سید رشید الدین صاحب حمیدی نور اللہ مرقدہ کی خاص دعوت پر آپ کی مرادآباد تشریف آوری ہوئی، بعد فراغت نکاح مجھے ایک طرف کو بلایا اور ارشاد فرمایا کہ نکاح کے بعد مجھے حضرت والد صاحب (شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ) نے ایک نصیحت فرمائی تھی میں نے اس پر عمل کیا اور اس کے فوائد محسوس کئے میں تمہیں بھی وہی بتانا چاہتا ہوں نصیحت یہ ہے کہ: جب اہلیہ سے ملاقات ہوتو اولا دو رکعت نفل نماز اس طرح پڑھنا کہ تم امام ہو اور بیوی مقتدی بعد ازاں دونوں رشتے کے مبارک ہونے اور جملہ خیرات و برکات کے سلسلہ میں دعاء کرنا انشاء اللہ بہت نفع ہوگا، بندہ نے اس پر عمل کیا اور اس کے خوشگوار اثرات آج تک باقی ہیں اور انشاء اللہ باقی رہیں گے۔

حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ اپنی معصومیت، بے نفسی، بزرگی اور للّٰہیت کے حوالہ سے ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ آپ پیر جی کے نام سے معروف تھے خود اس لقب کی وجہ بیان فرماتے ہیں:

> ”ایک مرتبہ اپنے کتب خانہ یحیوی پر بیٹھا کھیل کھیل میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو بیعت کررہا تھا، اتنے میں حضرت مدنیؒ کا تانگہ آگیا، حضرت تانگہ سے اترے اور مجھے بیعت کرتے دیکھا تو فرمایا کہ ”مجھے بھی بیعت کرلیں“ میں نے بلا تکلف کہہ دیا کہ آیئے اور حضرت مدنی کو بیعت کرلیا اس کے بعد سے حضرت مدنیؒ مجھے ”پیر صاحب“ ہی کہہ کے پکارتے اور ایک طرح سے یہ میرا لقب بن گیا“

خاندان کے چھوٹے بڑے سب آپ کو ماموں کہا کرتے تھے ممانی سے آپ کو بڑا لگاؤ تھا اور ان کا بہت خیال بھی رکھتے تھے، تقریبا سوا برس پہلے ان کے وصال کے بعد سے تو بہت ٹوٹ گئے

تھے اور خاموش خاموش رہنے لگے تھے۔

ممانی جو خود ولی صفت خاتون تھیں ضیعفی اور معذوری کے باوجود ماموں کی پوری نگرانی اور ان کی ضروریات کا بھر پور خیال رکھتی تھیں وقت پر دوا کھلانا، پرہیزی کھانے کا انتظام کرنا ان کی صحت کا خیال رکھنا وغیرہ، متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ باہر مجلس لگی ہوئی ہے، حضرت گفتگو فرمارہے ہیں، لوگ گوش بر آواز ہیں، زنان خانہ سے بچیاں آئیں اور دور کھڑے ہو کر آواز دی: ''ماموں! ممانی کہہ رہی ہیں بیٹھے بیٹھے بہت دیر ہوگئی، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، آرام کرلو' حضرت مسکراتے ہوئے جواب دیتے ''اچھا کہہ دو آرام کررہے ہیں'' پھر کبھی لیٹ جاتے اور کبھی نیم دراز ہو جاتے۔ اللہ اکبر!

آپسی تعلق اور احترام رائے کی یہ مثالیں کہاں ملتی ہیں؟ باری تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور انبیاء وصدیقین شہداء وصالحین کے زمرے میں شامل فرمائے۔

☆......☆......☆

اُردو کا جنازہ!!

وہ اُردو کا مشہور ومعروف محقّق، ادیب وشاعر تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں اُردو زبان وادب کی ترقی، اُس کی اشاعت اور مادری زبان کی اہمیت اور ضرورت پر سینکڑوں مقالے لکھے تھے۔ ایک دن اچانک اُس کا انتقال ہو گیا۔

اُس کی حادثاتی موت کے دو ماہ بعد اُن کے فرزندوں نے اپنے والد کی کتابوں کا اثاثہ باہر نکالا۔ کتابوں سے کئی الماریاں پُر تھیں، پاس پڑوس کے لوگ کتابوں کی الماریوں کے اطراف ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور اُن کے بچّے اس اثاثہ کو کباڑی کی دکان پر لے جانے کی تیاری کررہے تھے۔ وہ اثاثہ اب اُن کے کسی کام کا نہ تھا کیونکہ اُن کی پوری تعلیم انگلش میڈیم سے ہوئی تھی۔

(معروف ادیب جناب اشفاق احمد کی کتاب ''ایک زخم اور سہی'')

طب وصحت

بلڈ پریشر کا علاج

انسانی دل کے دھڑکنے کے عمل سے جو خون پورے انسانی جسم میں گردش کرتا ہے اور اسے مطلوبہ توانائی، غذائیت اور آکسیجن مہیا کررہا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم اپنی روزمرہ کے امور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ خون انسانی جسم میں گردش کے دوران شریانوں کی دیواروں پر دباؤ ڈالتا ہے اور اس دباؤ یا ٹکرانے کو بلڈ پریشر کہا جاتا ہے اور دباؤ یا ٹکراؤ کی یہ شدت اگر بڑھ جائے تو یہ حالت بلند فشارِ خون یا ہائی بلڈ پریشر کہلاتی ہے۔

بلڈ پریشر یا خون کے دباؤ کو ناپنے کے لئے اس کی پیمائش کی جاتی ہے اور اسے ملی میٹرز آف مرکری (mm Hg) کے ذریعے ناپا جاتا ہے۔ اور دو عدد میں لکھا اور پڑھا جاتا ہے یعنی جب بلڈ پریشر کی پیمائش ہوتی ہے تو اسے 120 / 80(mm Hg) لکھا جاتا ہے۔ پہلا عدد systolic ہوتا ہے اور یہ وہ سب سے بلند عدد ہوتا ہے جس پر بلڈ پریشر یا خون کا دباؤ پہنچا ہوتا ہے جبکہ دوسرا عدد Diastolic کہلاتا ہے جو سب سے نچلی سطح ہوتی ہے جس پر خون کا دباؤ پہنچ سکتا ہے۔ نارمل بلڈ پریشر 120 / 80 سے نیچے ہوتا ہے۔ اگر خون کا دباؤ کئی ہفتوں تک مسلسل 40 / 90 یا اس سے زیادہ ہو تو ہائی بلڈ پریشر کا مرض ہوسکتا ہے۔

بلڈ پریشر کا علاج: مولانا محمد مکی حجازی (مدرس مسجد الحرام) فرماتے ہیں: امریکہ کے ایک ڈاکٹر امیر خان نے بتایا کہ ''چھوٹی چندن'' (ایک لکڑی جو پنسار خانے پر دستیاب ہوتی ہے) کو پیس کر، اس کے پاؤڈر سے کیپسول بھر لیے جائیں۔ صبح وشام ایک کیپسول (کھانے کے بعد) کھانے سے بلڈ پریشر بڑھنے، کم ہونے کا مرض ختم ہوجائے گا۔ محمد ایوب مقبول گارمنٹس، فیصل آباد والے نے بتایا کہ ہم آپ کے لیے یہ کیپسول بنا کر لائے، یہ اتنے مفید ثابت ہوئے کہ جسے بھی یہ دیئے، ان کا بلڈ پریشر سو فیصد نارمل ہوگیا۔

مرے نام آتے ہیں

تاثرات

[استاذِ حدیث جامعہ اشرف العلوم رشیدی ومدیر ماہنامہ صدائے حق، گنگوہ مفتی محمد ساجد کھجناوری صاحب]

مکرم ومحترم حضرت مولانا ابن الحسن عباسی صاحب ادام اللہ افاضاتکم

مدیر ماہ نامہ التخیل کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج سامی بخیر ہوگا

فصیلِ دیوار ودر اور جغرافیائی حدود کے مسلمہ فلسفہ کے باوصف برقی نظام اور مواصلاتی سسٹم نے دنیا کے فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے، جس کا ایک خوش گوار پہلو یہ سامنے آیا ہے کہ علم ومطالعہ اور ایک دوسرے سے اخذ واستفادہ کے امکانات بڑی حد تک روشن ہو گئے ہیں۔ رب قدیر ہمیں ان امکانات ووسائل کو راست طور پر برتنے اور ان کے جائز استعمال کی توفیق سے نوازے۔ آمین

محترم والاصفات! ہمارے دیار میں آپ کی علمی وفکری نگارشات، خواہ وہ درسی کتب کی مقبول شروحات کے ذیل میں ہوں، مقالات ومضامین کی صورت میں ہوں یا ادبی سرگزشت کے قالب میں، ادھر ایک زمانہ سے اہل فکر ونظر کو شادکام کر رہی ہیں۔ آپ کے قلم میں بلا کی روانی ہے، اسلوبِ تحریر کی لذت، فکر وخیال کی وسعت اور اعتدال کی جامعیت سے آپ کا انفراد قائم ہے جس سے قاری کو دورانِ مطالعہ اپنا دامن مراد بھرنے اور فنی شہ پاروں کو سمیٹنے کا اشتیاق رہتا ہے۔

ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ ہمارے مدرسی ماحول میں جن اہل قلم مصنفین کی تحریروں کو شوق اور جذبہ کے ساتھ دیکھا اور پڑھا جاتا ہے، ان میں آپ کو شامل رکھنا حق بجانب ہوگا۔ اب یہ دوہری مسرت کا مقام ہے کہ التخیل جیسے مقصدی مجلہ کی شروعات آپ کی ادارت وسرکردگی میں ہوئی ہے جسے مزید معیاری بنانے کیلئے محترم محمد بشارت نواز جیسے تازہ

دم نوجوان افاضل کی خدمات فراہم ہیں، بندہ آپ اور تمام معاونین کو قلبی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

آج رسائل وجرائد حشرات الارض کی طرح نکل رہے ہیں، واٹس ایپ اور دوسرے راستوں سے بے ہنگم غیر مستند اور بے وزن مواد ادھر سے ادھر بکھرا پڑا ہے، ایسے ماحول میں النخیل کی افادیت دوآتشہ ہوگئی ہے۔اس کے صفحات پر ہمہ گیر موضوعات کو مشق قلم بنانے کی کامیاب کوشش جاری ہے، مولانا عباسی صاحب نے افتتاحی شمارہ میں معاصر اہل علم وقلم کے ایک دوسرے سے بیزار مختلف طبقات کو جس طرح باہم قریب کرنے کا عندیہ دیا ہے، وہ ہماری صحت مند روایت کا نقطۂ آغاز ثابت ہوسکتا ہے۔ادب کے بازار میں جو کش مکش اور خلیج دیکھنے کو مل رہی ہے اس نے تعمیری ادب کے فیضان کو بھی محدود کردیا ہے جس سے پاکیزہ افکار واحساسات کی تعمیر کمزور پڑ رہی ہے۔

اللہ کرے النخیل تعمیری ادب کے باب میں جرس کارواں کے طور پر دیکھا جائے اور قلم وکتاب کے رسیا اسے ہاتھوں ہاتھ لیں۔

والسلام

محمد ساجد کھجناوری

۱۸/اگست ۲۰۱۹

[استاذِ حدیث جامعہ خیر المدارس ومدیر ماہنامہ الخیر، ملتان مولانا محمد ازہر صاحب]

حضرت مولانا ابن الحسن عباسی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج جامعہ خیر المدارس میں ایک ساتھی نے آن جناب کی طرف سے ہدیہ جلیلہ بصورت النخیل عطا فرمایا۔ بلا تکلف عرض ہے کہ ظاہری وباطنی محاسن اور زبان وادب کے جامع، ایسے جرائد کم کم نظر سے گزرے ہیں۔آپ کا مختصر مگر جامع اداریہ بہت پسند آیا، باقی مضامین کا انتخاب بھی قابل تحسین ہے۔نقشِ ثانی کو دیکھ کر نقش اول کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔اللہ تعالی آپ کے علم وقلم کو امت کے لیے زیادہ سے زیادہ نافع بنائیں آمین۔

محمد ازہر

اصلاحِ معاشرہ

لمحاتِ زندگی کو قیمتی بنانے کا مجرب نسخہ

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ایک تجربہ کی بات بتاتا ہوں، وہ یہ کہ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ: یا اللہ! یہ دن طلوع ہورہا ہے، اور اب کارزارِ زندگی میں داخل ہونے والا ہوں، اے اللہ! اپنے فضل و کرم سے اس دن کے لمحات کو صحیح مصرف پر خرچ کرنے کی توفیق عطا فرما کہ کہیں وقت ضائع نہ ہوجائے، کسی نہ کسی خیر کے کام میں صرف ہوجائے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پڑھا کرتے تھے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَقَالَنَا یَوْمَنَا ھٰذَا وَ لَمْ یُھْلِکْنَا بِذُنُوْبِنَا

یعنی اس اللہ کا شکر ہے جس نے یہ دن ہمیں دوبارہ عطا فرما دیا اور ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہمیں ہلاک نہیں کیا۔ ہر روز سورج نکلتے وقت یہ کلمات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پڑھا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تو اس کے مستحق تھے کہ یہ دن ہمیں نہ ملتا اور اس دن سے پہلے ہی ہم اپنے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کردیئے جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ہلاک نہیں کیا اور یہ دن دوبارہ عطا فرمایا۔

لہٰذا پہلے یہ احساس دل میں لائیں کہ یہ دن جو ہمیں ملا ہے، یہ ایک نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں عطا فرمادی ہے، اس دعا کے ذریعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں کہ ہر دن کی قدر اس طرح کرو جیسے ہم سب رات کے وقت ہلاک ہونے والے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے زندگی دیدی، اب یہ جو نئی زندگی ملی ہے، وہ کسی صحیح مصرف میں استعمال ہوجائے۔

صبح کی مسنون دعاؤں کا معمول بنالیں: حدیث شریف میں وہ دعائیں منقول ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ صبح کو فجر کے بعد پڑھا کرتے تھے، ہم سب بھی نماز فجر کے بعد اس کے پڑھنے کا معمول بنالیں، وہ دعائیں یہ ہیں:

(1).... اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَ ھٰذَا الْیَوْمِ وَ خَیْرَ مَابَعْدَہٗ وَ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ ھٰذَا الْیَوْمِ (ترمذی) اے اللہ! میں آپ سے آج کے دن کی خیر طلب کرتا ہوں اور اس کے بعد کی خیر طلب کرتا ہوں اور اس دن کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

(2).... اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ خَیْرَ ھٰذَا الْیَوْمِ وَ فَتْحَہٗ وَ نَصْرَہٗ وَ نُوْرَہٗ وَ بَرَکَتَہٗ وَ عَافِیَتَہٗ وَ ھُدَاہُ (ابوداؤد) اے اللہ! میں آپ سے آج کے دن کی خیر طلب کرتا ہوں اور اس دن کی کامیابی، نصرت نور، برکت، عافیت اور ہدایت طلب کرتا ہوں۔

(3).... اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ ھٰذَا النَّھَارِ صَلَاحًا، وَ اَوْسَطَہٗ فَلَاحًا، وَ آخِرَہٗ نَجَاحًا اے اللہ! آج کے دن کے ابتدائی حصہ کو میرے لئے صلاح بنادیجئے اور اس کے درمیانی حصہ کو فلاح اور آخری حصہ کو کامیابی بنادیجئے۔

یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری دعائیں ہیں، ان کو یاد کرلیں اور روزانہ صبح کے وقت ان کو پڑھا کریں اور اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگیں کہ: اے اللہ! اس دن کے ایک ایک لمحے کو اپنی رضا کے مطابق صرف کرنے کی توفیق عطا فرما۔ بہرحال! پہلے نظم الاوقات بناؤ اور پھر اس بات کا عزم کرو کہ میں اس کی پابندی کروں گا، پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور توفیق مانگو، اس کے بعد کارزارِ زندگی میں داخل ہوجاؤ۔

رات کو سوتے وقت دن کا جائزہ: پھر رات کو سوتے وقت اپنا دن بھر کا جائزہ لے لو کہ آج صبح میں نے جو ارادہ کیا تھا، اس پر کس حد تک قائم رہا اور کہاں کہاں بھٹک گیا، جہاں بھٹک گئے تھے، اس کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرکے دوبارہ اپنے عزم کو تازہ کرلو اور جس حد تک قائم رہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، ساری عمر یہی کام کرتے رہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ بیڑہ پار کردیں گے۔

جامعہ کی سرگرمیاں

شب و روز

☆......10 ذیقعدہ 1440ھ مدرسۃ الصدیق الاسلامیہ، گجرات کے بانی و مہتمم، مسئول وفاق المدارس، گجرات مولانا الیاس احمد صاحب نے مدیر جامعہ سے ان کے گھر پر ملاقات کی، مولانا محمد رمضان صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔

☆...... 25 ذیقعدہ 1440ھ کو جمعیت علماء اسلام، آزاد کشمیر کے امیر اور وفاق المدارس، آزاد کشمیر کے مسئول مولانا قاضی محمود الحسن اشرف اور آپ کے بھائی مولانا سعید الحسن صاحب نے مدیر جامعہ سے ان کے گھر پر ملاقات کی۔ علمی، تصنیفی اور دیگر اہم امور پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

☆...... 26 ذی قعدہ 1440ھ کو جامعہ کے استاذ مولانا اکرم علی شاہ صاحب کے والد طویل عرصہ علیل رہنے کے بعد انتقال فرما گئے۔ ان کی نماز جنازہ میں شرکت اور تعزیت کے لیے مدیر جامعہ سمیت تمام اساتذہ تشریف لے گئے۔

☆......28 ذیقعدہ 1440ھ کو مدیر جامعہ، مولانا منظور یوسف صاحب کی دعوت پر ان کے قائم کردہ ادارے جامعہ علیؓ میں تشریف لے گئے اور علماء و طلبہ سے خطاب فرمایا۔

☆......03 ذی الحجہ 1440ھ کو جامعہ کے بزرگ استاذ مولانا محبوب الرحمن صاحب کی والدہ مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ مدیر جامعہ سمیت تمام اساتذہ نے ان سے اظہار تعزیت کیا۔

☆......گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی جامعہ میں 06 ذی الحجہ کو طلبہ کا یک ماہی جائزہ لیا گیا، جس میں ہر درجہ کی تین کتابوں کا تحریری جائزہ لیا گیا۔

☆......06 ذی الحجہ 1440ھ تا 16 ذی الحجہ جامعہ میں عید الاضحیٰ کی تعطیلات رہیں۔

☆......گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی جامعہ تراث الاسلام کے زیر انتظام، اجتماعی قربانی اور چرم قربانی جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا، جس میں جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ ان تمام امور کی سرپرستی مدیر جامعہ نے از خود فرمائی۔

☆......عیدالاضحیٰ کی تعطیلات کے بعد 17 ذی الحجہ 1440ھ سے باقاعدہ اسباق کا آغاز ہو گیا۔ مدیر جامعہ نے بھی سفر سے واپسی پر اپنے اسباق (بخاری جلد اول، مشکوٰۃ جلد اول اور مقدمہ شامی) باقاعدہ شروع کر دیئے۔

☆......13 ذی الحجہ 1440ھ کو مدیر جامعہ لاہور تشریف لے گئے۔

☆......19 اگست 2019ء کو مدیر جامعہ کی ماہنامہ النخیل کی مجلسِ مشاورت کے رکن، جمعیت علماء اسلام، لاہور کے راہنما اور دارالکتاب (علمی و تحقیق کتابوں کا ناشر ادارہ) کے مالک حافظ ندیم صاحب اور جمعیت علماء اسلام، پشاور کے رہنما اور سابق صوبائی وزیر، خیبر پختونخواہ مولانا امان اللہ صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔اسی روز مشہور کتاب دوست و محقق جناب شبیر میواتی صاحب سے بھی تفصیلی ملاقات ہوئی اور مختلف کتابوں کے سلسلے میں اہم مشاورت ہوئی۔

☆......18 ذی الحجہ 1440ھ 20 اگست 2019ء کو مدیر جامعہ، مفتی عبداللہ اسلم صاحب کے ساتھ دلائل الخیرات کے مختلف نسخوں کی تلاش میں اہم اداروں میں تشریف لے گئے، اسی دوران قدیم جامعہ اشرفیہ (نیلا گنبد) میں جانا ہوا جہاں جامعہ کے اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔

☆......19 ذی الحجہ 1440ھ 21 اگست 2019ء کو مدیر جامعہ کی حافظ ندیم صاحب کے ہمراہ قرآن بورڈ، پنجاب اور پاکستان علماء کونسل کے چیئرمین مولانا طاہر اشرفی صاحب سے ان کے گھر پر تین گھنٹے تک طویل ملاقات ہوئی۔اس ملاقات میں مختلف امور زیرِ بحث آئے خصوصاً عالم عرب کی یونیورسٹیوں سے پاکستانی مدارس کے معادلے کے سلسلے میں ان کی تجاویز حاصل کی گئیں۔

☆......21 ذی الحجہ 1440ھ 23 اگست 2019ء کو مدیر جامعہ مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب (ناظم اعلیٰ وفاق المدارس پاکستان) کی دعوت پر جامعہ خیر المدارس ملتان تشریف لے گئے، وہاں مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب سے تصنیفی و تحریری حوالوں سے طویل مشاورت ہوئی۔ جامعہ خیر المدارس میں دو دن قیام کے دوران جامعہ کے مختلف اساتذہ اور معاون مدیر ماہنامہ النخیل ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔اسی دوران جامعہ کے ناظم مولانا عبدالمنان صاحب کی طرف سے ضیافت کی گئی۔دو دن قیام کے بعد 25 اگست 2019ء کو کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔